تدبر

زیر نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبر قرآن وحدیث

لاہور۔ پاکستان

سلسلہ ۲۰ جمادی الثانی ۱۴۰۷ھ فروری ۱۹۸۷ء

تدبر

فہرستِ مضامین

تذکرہ و تبصرہ

بین الاقوامی برادری کی مسلم اقلیتیں ——— خالد مسعود ۳

تدبر قرآن

تفسیر سورۂ نساء (۳) ——— خالد مسعود ۱۲

حکمت قرآن

جبر و اختیار کا مسئلہ

فلسفہ اور قرآن کی روشنی میں (۱) ——— امین احسن اصلاحی / محبوب سبحانی ۲۶

افادات فراہی

مولانا فراہیؒ کے قلمی حواشی

الاتقان فی علوم القرآن پر (۳) ——— ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی ۴۲

مجلسِ ترتیب:

- خالد مسعود (مدیر)
- عبداللہ غلام احمد
- ماجد خاور
- محبوب سبحانی

ناشر: ——— ادارہ تدبرِ قرآن وحدیث
رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، رحمن آباد، لاہور - ۲۵
مطبع: ——— المطبعۃ العربیۃ - لاہور
قیمت: =/۴ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ وتبصرہ

خالد مسعود

بین الاقوامی برادری کی مسلم اقلیتیں

کرۂ زمین پر مسلمانوں کی صحیح تعداد کتنی ہے اور وہ کہاں کہاں آباد ہیں؟ دنیا کے کس کس حصے میں وہ اقلیت میں ہیں اور یہ اقلیت کن حالات سے دوچار ہے؟ یہ اقلیتیں کیسے وجود میں آئیں اور اب ان کے بطور مسلمان پنپنے کے کیا امکانات ہیں؟ مسلمانوں کے انتہائی تنگ دل معاندکون ثابت ہوئے ہیں؟ یہ سوالات ملتِ اسلامیہ کے ہر بہی خواہ کے ذہن میں پیدا ہوتے رہے ہیں لیکن ان کا کوئی مدلل اور واضح جواب موجود نہ تھا۔ اب مراکش کے ایک فرزند ڈاکٹر علی الکتّانی نے خاص اس موضوع پر ایک کتاب لکھ دی ہے جس میں اس طرح کے تمام سوالوں کا جواب قاری کو مل جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب پیشے کے لحاظ سے ایک انجینیر اور شمسی توانائی پر بین الاقوامی حلقوں میں ایک سند مانے جاتے ہیں۔ اس وقت وہ جدہ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی اسلامی فاؤنڈیشن کے ناظمِ اعلیٰ ہیں۔ وہ مدت سے مسلم اقلیتوں کے حالات ومعاملات سے اپنے آپ کو منسلک رکھے ہوئے ہیں اور اس میدان میں بھی ان کی معلومات نہایت مستند سمجھی جاتی ہیں۔ ان کی زیرِ نظر کتاب کا نام MUSLIM MINORITIES IN THE WORLD TODAY ہے جو لندن سے مینسل پبلشنگ نے شائع کی ہے۔

ڈاکٹر الکتانی کے اس جائزے میں وہ تمام ممالک شامل ہیں جن میں مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ یا اس سے زیادہ ہے۔ انہوں نے اعداد وشمار کی روشنی میں ۱۹۸۲ء میں دنیا میں مسلمانوں کی تعداد کا تخمینہ ایک ارب تین کروڑ لگایا ہے۔ بیتالیس ممالک اسلامی کانفرنس کی تنظیم میں شامل ہیں۔ ان میں سے ۲۳ ممالک براعظم افریقہ، ۲۱ ایشیا اور ایک یورپ میں واقع ہے۔ ایک دو افریقی ریاستوں کے استثناء کے ساتھ ان سب میں مسلمان غالب اکثریت میں ہیں جن کی کل آبادی ۶۴ کروڑ ہے۔ اس تنظیم سے باہر انچاس[۴۹] ایسے ممالک ہیں جن میں ۳۹ کروڑ مسلمان اقلیت کے طور پر رہ رہے ہیں۔ ان ممالک میں سے ۱۸ ملک براعظم افریقہ، ۱۲ یورپ، ۱۱ ایشیا، شمال وجنوبی

امریکہ اور ایک بحرالکاہل میں واقع ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کا ۳۷ء۶۸ فی صد حصہ براعظم ایشیا میں، ۲۴ء۲۴ فیصد افریقہ میں اور ۳ء۴۰ فی صد یورپ اور امریکہ وغیرہ میں آباد ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کی چالیس فی صد آبادی چھ بڑے مسلم ممالک ـــــ انڈونیشیا، پاکستان، بنگلہ دیش، ترکی، مصر، اور ایران ـــــ میں مرکوز ہے۔ تیس فی صد آبادی چار بڑی اقلیتوں کی صورت میں چین، ہندوستان، نائجیریا اور سوویت روس میں رہ رہی ہے اور ۲ء۲۶ فی صد دنیا کے باقی ممالک میں پھیلی ہوئی ہے۔ مجموعی طور پر مسلمانوں کی تعداد دنیا کی کل آبادی کا ایک چوتھائی ہے جبکہ مغربی مصنفین عموماً اسے چھٹا یا ساتواں حصہ قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اس تفاوت کا سبب صحیح اعداد و شمار تک رسائی کی مشکل ہے۔ مسلم اقلیت کے علاقوں میں حکومتیں سیاسی وجوہات کی بنا پر مسلمانوں کی تعداد کو کم ظاہر کرتی ہیں یا سرے سے ان کو الگ مذہبی گروہ کی حیثیت سے شمار ہی نہیں کیا جاتا ـــــ ڈاکٹر صاحب نے ایسے ممالک کی اقلیتوں سے براہِ راست معلومات حاصل کی ہیں اور ان کی صحت کو جانچنے کے لیے انہوں نے مختلف طریقوں پر انحصار کیا ہے۔ مسلمانوں کی آبادی میں قدرتی اضافہ تین فی صد سالانہ کی شرح سے ہو رہا ہے۔

دنیا کے جن علاقوں میں مسلمانوں کی حکومتیں کبھی قائم رہی ہیں وہاں مسلمان آج بھی موجود ہیں۔ اگر وہ اکثریت میں ہیں تو بالعموم علاقے کی حکومت بھی انہی کے ہاتھوں میں ہے۔ البتہ کہیں کہیں صورتِ حالات ان کے موافق نہیں رہی۔ مثلاً یورپ کے ملک البانیہ میں اکیس لاکھ مسلمان ہیں جو ملک کی کل آبادی کا تین چوتھائی حصہ ہیں لیکن وہاں ۱۹۴۶ء سے کمیونسٹ برسرِ اقتدار ہیں جو ہر ممکن طریقہ سے اسلام کی بیخ کنی پر تلے ہوئے ہیں اور انہوں نے مسلمان آبادی پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ بلغاریہ میں اس صدی کے ابتدائی نصف میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ کمیونسٹوں کے تسلط کے بعد ان کی نسل کشی کی پالیسی اختیار کی گئی جس کے نتیجہ میں لاکھوں مسلمان ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اب وہ اقلیت میں ہیں اور حکومت کے آگے بالکل بے بس ہیں۔ اسی طرح وسط ایشیا اور جنوبی روس کے بعض صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں تاہم روس میں ان علاقوں کے ضم ہونے کے باعث پورے ملک کی آبادی کے مقابلہ میں وہ اقلیت میں ہیں چین میں سنکیانگ، اونی منگولیا اور چنگ ہائی کے صوبوں میں بھی یہی کیفیت ہے اور علاقائی اکثریت کے باوجود ملک کی مجموعی آبادی میں مسلمانوں کا تناسب دس میں ایک ہے۔ افریقہ کے ممالک ـــــ ایتھوپیا، نائجیریا اور تنزانیہ میں مسلمان اگرچہ اکثریت میں ہیں لیکن حکومتیں عیسائی یا کمیونسٹ ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ عملاً ایک اقلیت کا سلوک کر رہی ہیں۔

مسلمان اقلیتوں کے اس جائزہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اسلام صوفیوں کے ذریعہ سے ہی نہیں نہیں پھیلا، جیسا کہ عام طور پر قیاس کیا جاتا ہے، بلکہ اس کے اسباب متعدد رہے ہیں۔ اسلام کے عروج کے

زمانہ میں دنیا کے جو علاقے مسلمانوں کے زیرنگیں آئے وہاں اسلام کے قدم مضبوطی سے جم گئے۔ اس میں ایک نمایاں استثنا ہسپانیہ کا ہے جہاں اگرچہ مسلمانوں کی حکومت چھ سو برس تک قائم رہی لیکن بالآخر ان کی حالت اس قدر دگرگوں ہوئی کہ ملک میں کوئی مسلمان متنفس باقی نہ رہا۔ جنوبی ہند، سری لنکا، مشرقی افریقہ کے ساحلی ممالک، برما، ملایا، انڈونیشیا اور چین کے بعض علاقوں میں مسلمان تاجر اسلام کا پیغام لانے کا ذریعہ بنے اور انہوں نے وہاں کی آبادی کو متاثر کر کے مسلمان بنا لیا۔ امریکہ دریافت ہوا تو ہسپانیہ اور پرتگال نے اس کی آبادکاری کے لیے اپنے باشندوں کو وہاں بھیجا۔ اس طرح جو لوگ امریکہ منتقل ہوئے ان میں عیسائی آبادی کے علاوہ وہ لوگ بھی تھے جو دل سے مسلمان تھے لیکن حکومت نے زبردستی انہیں بپتسمہ دے رکھا تھا۔ نئے ماحول میں جا کر انہوں نے اسلام کے ساتھ اپنی وابستگی ظاہر کر دی۔ چونکہ یہ لوگ اقلیت میں تھے اس لیے ہسپانیہ اور پرتگال کی حکومتوں نے وہاں بھی ان پر ظلم و زیادتی کی ہر قسم کو آزمایا تاہم وہ اپنا وجود باقی رکھنے میں کامیاب ہوئے اور انہی کی نسل آج ارجنٹائن، برازیل، میکسیکو، ٹرینیڈاڈ، ٹوباگو، سوری نام اور گے آنا میں خاصی بڑی تعداد میں آباد ہے۔ ان ممالک میں اسلام کے داخل ہونے کا دوسرا اہم ذریعہ وہ افریقی بنے جن کو یورپی اقوام نے افریقہ سے پکڑ کر امریکہ کی منڈیوں میں غلام بنا کر بیچا۔ ان میں خاصی تعداد مسلمانوں کی تھی جنہوں نے وہاں اپنا اسلامی تشخص قائم رکھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے متحد ہو کر بغاوتیں بھی کیں لیکن عیسائی اکثریت کے مقابل میں ان کی کوئی پیش نہیں چلی۔ اس نے ہر ممکن طریقے سے مسلمان نسل کو اسلام سے بیگانہ کرنے کی کوشش کی۔ اس صدی میں امریکی گوروں کے اندر نسلی امتیاز کے احساس نے امریکہ کی سیاہ فام آبادی میں دوبارہ یہ شعور پیدا کیا ہے کہ وہ افریقہ کے غالب دین ـــ اسلام ـــ کے ساتھ وابستہ ہو جائے چنانچہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اس وقت مسلمانوں کی تعداد تیس لاکھ تک پہنچ چکی ہے اور اس میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ یہی تحریک برازیل کی سیاہ فام آبادی میں بھی چل رہی ہے۔ مشرقی یورپ کے ممالک پر کمیونسٹوں کے تسلط کے بعد یوگوسلاویہ، البانیہ، رومانیہ اور ہنگری کے لاکھوں مسلمانوں نے ہجرت کی اور وہ مغربی یورپ کے کئی ممالک، آسٹریلیا اور جنوبی امریکہ کی ریاستوں میں آباد ہو گئے۔ ان ممالک میں اسلام کا وجود ان مہاجرین کا مرہونِ منت ہے۔ بیسویں صدی میں انگلستان، فرانس، ہالینڈ وغیرہ یورپی ممالک کی نوآبادیاں ختم ہو گئیں تو ان نوآبادیوں کے باشندوں کو یہ موقع ملا کہ وہ سابق آقاؤں کے ملکوں میں ان کی سابق رعایا ہونے کے ناطے شہریت کے حقوق حاصل کر سکیں۔ چنانچہ برصغیر ہند، مشرق وسطیٰ اور افریقہ کے ممالک سے لاکھوں باشندے یورپ میں آباد ہو گئے۔ ان میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔

ان کی جمعیت کے باعث ان ملکوں میں مسلم اقلیت کے مراکز قائم ہو گئے ہیں۔ جدید ترین مسلم اقلیت کوریا میں پیدا ہوئی ہے۔ ۱۹۵۰ء کے عشرے میں اقوام متحدہ کی جو فوج اس علاقے میں تعینات ہوئی۔ اس میں ایک دستہ

ترک فوج کا بھی تھا۔ انھوں نے اپنی چھاؤنی میں ایک عارضی مسجد بنائی جس نے کوریائی باشندوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ اسلام کے نظامِ زندگی نے ان لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ کوریا میں اسلام قبول کرنے کی ایک رو چل پڑی۔ اب وہاں مسلمانوں کی تعداد بائیس ہزار سے متجاوز ہے۔ روس کی کمیونسٹ حکومت نے تاتاری نسل کے مسلمان باشندوں پر سخت ظلم و تشدد کیا تو ان میں سے کچھ لوگ جاپان کو نکل گئے۔ ان کے باعث اسلام جاپان میں داخل ہوا اور اس وقت جاپانی مسلمانوں کی تعداد تیس ہزار ہے۔ چونکہ جاپان اور کوریا میں مذہبی آزادی ہے اور یہاں کے باشندے تنظیم کا شعور رکھتے ہیں اس لیے ڈاکٹر الکتانی کو ان دونوں ممالک کے مسلمانوں سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

مختلف ممالک میں مسلمانوں کی تاریخ کا جائزہ لینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے انتہائی متعصب اور کٹر دشمن عیسائی اور کمیونسٹ ثابت ہوئے ہیں۔ عیسائی تعصب کا سب سے بڑا تجربہ مسلمانوں کو اندلس میں ہوا۔ یہ علاقہ مشرقی جرمن کے غارت گروں کی زد میں تھا جب یہاں کے باشندوں نے مسلمان جرنیل موسیٰ بن نصیر کو مدد کے لیے پکارا۔ ۷۱۳ء میں اسے آزاد کرایا گیا اور اس کا انتظام المغرب کی مسلمان حکومت نے سنبھالا۔ ۷۵۶ء میں یہاں اموی سلطنت قائم ہو گئی۔ اس علاقے میں شمالی افریقہ سے بھی مسلمان آ کر آباد ہو گئے لیکن زیادہ تعداد اندلس کے اپنے باشندوں کی تھی جو مسلمان ہو گئے۔ اموی حکومت نے کئی سو سال تک ملک کو متحد رکھا اور اس کو اتنی ترقی دی کہ ہسپانیہ دوسرے یورپی ممالک کے لیے روشنی کا مینار بن گیا۔ جب مسلمان حکومت کمزور ہو گئی تو نسلی امتیاز کے بھوت نے سر اٹھایا۔ ملک میں طوائف الملوکی پیدا ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں اپنا تحفظ نہ کر سکیں اور عیسائیوں کے قبضہ میں آ گئیں۔ ۱۴۹۲ء میں آخری ریاست غرناطہ کی شکست کے بعد مسلمانوں کی حیثیت دوسرے درجے کے شہری کی ہو گئی جن پر ہر ظلم روا رکھا گیا۔ سولہویں صدی میں ان کو زبردستی عیسائی بنانے کی تحریک شروع ہوئی۔ ان زبردستی بپتسمہ دیے گئے مسلمانوں کو 'موریسکو' MORISCO کا نام دیا گیا۔ ان میں سے کسی کے بارے میں یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ دل سے مسلمان ہے تو اس کو سولی پر چڑھا دیا جاتا یا زندہ جلا دیا جاتا۔ ہزاروں موریسکو جنوبی امریکہ کی آبادکاری کے لیے بھیجے گئے اور مختلف حالات میں انھوں نے اپنا اسلام ظاہر کر دیا لیکن عیسائی تعصب نے وہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ خود اندلس میں مسلمانوں نے منظم بغاوتیں کیں لیکن وہ کوئی بڑی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ بالآخر وہ ۱۶۰۹ء میں حکومت سے ملک چھوڑنے کی اجازت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے اور پانچ برس میں انھوں نے ملک خالی کر دیا۔ یہی سلوک یونان اور مشرقی یورپ کے ممالک کی کئی عیسائی حکومتوں نے بھی مسلمانوں کے ساتھ کیا اور آج ایتھوپیا، برازیل اور فلپائن کی عیسائی ریاستوں میں بھی ان کی نسل کشی کی جا رہی ہے۔

کمیونسٹوں کو جہاں کہیں بھی تسلط حاصل ہوا ہے انھوں نے مسلمانوں کو اپنی راہ کا سنگِ گراں سمجھا ہے

اور ان کی بیخ کنی کے منصوبے بنائے ہیں۔ روس کے ایک تہائی رقبہ میں مسلمان بڑی تعداد میں ہیں اور ترکمانستان، ازبکستان، قازقستان، تاجکستان، آذربائیجان اور کرغیزیہ میں تو اب بھی مسلمانوں کی اکثریت ہے لیکن حکومت نے ان کو کچلنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان کی آبادیوں میں دہشت پھیلائی گئی، لیڈروں کو قتل کیا گیا، املاک کو ضبط کر لیا گیا، مساجد اور دینی مظاہر کو تباہ کیا گیا، لاکھوں مسلمان مصنوعی قحط پیدا کر کے موت کے گھاٹ اتار دیے گئے، لاکھوں کو ان کے علاقوں سے نکال کر دور دراز غیر آباد علاقوں میں بسنے پر مجبور کیا گیا۔ تاتاری نسل کے مسلمانوں کی تو قومی جمعیت ہی بالکل ختم کر دی گئی۔ یہی سلوک مسلمانوں کے ساتھ ان ممالک میں ہوا جہاں سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ مثلاً یورپ میں البانیہ، یوگوسلاویہ، بلغاریہ اور رومانیہ میں، افریقہ میں تنزانیہ اور موزمبیق میں اور ایشیا میں برما، کمبوڈیا، چین اور منگولیا میں مسلمان انتہائی ظلم و تعدی کا نشانہ بنے ہیں اور کمیونزم نے ان کو کبھی پنپنے نہیں دیا۔

ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کے مطابق اس وقت دنیا میں سب سے بڑی مسلم اقلیتیں جن کی تعداد پچاس لاکھ سے زیادہ ہے حسب ذیل ممالک میں ہیں۔

چین	مسلمان دس کروڑ ستر لاکھ	کل آبادی کا ۵ء۱۰ فی صد
انڈیا	ساڑھے آٹھ کروڑ	۱۲ فی صد
نائجیریا	ساڑھے پانچ کروڑ	ساٹھ فی صد
روس	پونے پانچ کروڑ	۱۷ء۸ فی صد
ایتھوپیا	دو کروڑ پانچ لاکھ	ساٹھ فی صد
تنزانیہ	ایک کروڑ چار لاکھ	۵۵ فی صد
فلپائن	باسٹھ لاکھ	۱۲ء۲ فی صد
تھائی لینڈ	ساٹھ لاکھ	۱۲ فی صد
کینیا	ترپین لاکھ	۳۰ فی صد

ان ممالک میں نائجیریا، ایتھوپیا اور تنزانیہ میں اگرچہ مسلمان اکثریت میں ہیں لیکن حکومت متعصب عیسائیوں یا کمیونسٹوں کے ہاتھوں میں ہے۔ لہٰذا یہ ممالک اسلامی تنظیم میں شامل نہیں ہوئے اور مسلمان وہاں عددی اکثریت رکھنے کے باوجود عملاً اقلیت ہی کے حقوق رکھتے ہیں۔ لہٰذا ڈاکٹر صاحب نے ان ممالک کو مسلم اقلیت ہی کا علاقہ شمار کیا ہے۔

موجودہ چین کا مغربی علاقہ پہلی ہجری میں اس وقت اسلام سے روشناس ہوا جب قتیبہ بن مسلم کے

زیرکمان کاشغر کو فتح کیا گیا۔ چینیوں نے صلح جوئی کی پالیسی اختیار کی جس کے باعث مسلمانوں کی پیش قدمی رک گئی۔ البتہ چین کے ساتھ ثقافتی تعلقات قائم ہوگئے۔ جن کے نتیجے میں اس کے مغربی علاقوں میں لوگ اسلام سے وابستہ ہوگئے۔ تیرھویں صدی عیسوی سے سترھویں صدی عیسوی تک منگول اور منگ خاندانوں کی حکومتوں میں ان مسلمانوں کو عزت واحترام حاصل رہا اور وہ حکومت میں دخیل رہے۔ ۱۶۴۴ء میں مانچو خاندان برسرِاقتدار آگیا جس نے ان پر بڑی سختیاں کیں۔ مسلمان رعایا حکمرانوں کے خلاف کئی مرتبہ برسرِپیکار رہی۔ بالآخر اس نے جمہوریت پسند طاقتوں کا ساتھ دے کر ۱۹۱۱ء میں اس ظالم حکومت سے نجات پائی۔ اس کے بعد ۳۸ سالوں میں احیائے دین کا نہایت مفید کام ہوا اور اقتدار میں بھی مسلمانوں نے حصہ پایا۔ ۱۹۴۸ء میں ماؤزے تنگ کے کمیونسٹ انقلاب کے بعد پھر مسلمانوں پر شدید مظالم ڈھائے گئے۔ ماؤ کے بعد چینیوں نے جب سے چار کے ٹولے سے نجات حاصل کی ہے، حکومت کی پالیسیوں میں قدرے تبدیلی آئی ہے اور اس وقت مسلمانوں کو پھر سے اپنے دین کے اظہار کا موقع حاصل ہے۔ چونکہ چین اور روس کے سرحدی علاقے میں دونوں جانب مسلمان اکثریت میں ہیں اس لیے دونوں حکومتیں ان کو اتنا ناراض نہیں کرنا چاہتیں کہ وہ مشتعل ہوجائیں۔ یہ پوزیشن مسلمانوں کے لیے مفید نظر آتی ہے۔

روس کی حکومت نے مسلمانوں کے خلاف اپنی پالیسی میں کوئی تبدیلی ابھی تک پیدا نہیں کی۔ مسلمانوں نے کمیونسٹ حکومت کے ابتدائی تیس سالوں میں بغاوت کی راہ اختیار کی اور بہت نقصان اٹھایا۔ اب انہوں نے ایسا رویہ اپنایا ہے جس سے وہ اپنے دین پر کاربند بھی رہ سکیں اور حکومت کو بھی اشتعال نہ دلائیں۔ اس پالیسی نے مسلمانوں کی جمعیت کو فائدہ پہنچایا ہے۔ نوجوانوں میں خود اعتمادی پیدا ہوئی ہے اور انہوں نے لادینیت کی ترغیب دینے والے کمیونسٹ کارکنوں کو بھی بے بس کر دیا ہے۔ اب وہ دینی اجتماعات منعقد کر لیتے ہیں۔ گھروں میں نماز باجماعت کا انتظام کرتے ہیں اور وقتاً فوقتاً بے ضرر عنوانوں پر کانفرنسیں منعقد کر کے دوسرے ممالک کے مسلمانوں کو بھی ان میں شریک کرتے ہیں۔ ان کامیابیوں سے وہ اب پہلی سی گھٹن محسوس نہیں کرتے جس سے یہ توقع پیدا ہو گئی ہے کہ کمیونسٹ حکومت کی مذہب دشمن پالیسی کے باوجود مسلمان اپنا تشخص برقرار رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

برِصغیر ہند کی تقسیم کے بعد بھارت میں مسلمان اگرچہ بارہ فی صد ہیں لیکن ہندوؤں نے ان کو آہستہ آہستہ ثانوی حیثیت میں لا ڈالا ہے۔ سرکاری ملازمتوں میں ان کی نمائندگی صرف دو فی صد ہے اور وہ بھی زیادہ تر ذمہ داری کے عہدوں پر نہیں۔ اردو زبان کو نوے فی صد مسلمان سمجھتے ہیں اور اس میں ان کے بیشتر دینی علوم منتقل کیے جا چکے ہیں لیکن اس کو حکومت زبان کی حیثیت سے پنپنے کا کوئی موقع نہیں دینا چاہتی جس کے نتیجہ

میں مسلمانوں کی نئی نسل اپنے دینی ورثہ سے بے بہرہ ہو رہی ہے۔ مسلمانوں نے جتنے تعلیمی ادارے قائم کیے ان کو حکومت نے قبضہ میں لے کر ہندو منتظمین کے حوالے کر دیا ہے اور ان میں تعلیم اب زیادہ تر ہندو طالب علم ہی پا رہے ہیں۔ نصاب تعلیم خالص ہندوانہ ہے اور مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کر کے پڑھایا جاتا ہے۔ زرعی و صنعتی میدان میں حکومت کی پالیسی تعصب پر مبنی ہے۔ زراعت کے میدان میں 'سبز انقلاب' کے اثرات سے مسلمانوں کی زمینوں کو فائدہ نہیں پہنچنے دیا گیا۔ ان صنعتوں کے بارے میں معاندانہ پالیسی اپنائی گئی ہے جن میں مسلمان قدرے نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ مزید برآں مسلمانوں کی نسل کشی کی جا رہی ہے۔ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۸۳ء تک بیس سالوں میں ہندوستان میں ۴۸۶، ہندو مسلم فسادات ہوئے جن میں ہندوؤں کو پولیس اور فوج کی پشت پناہی حاصل تھی اور انہوں نے باہم مل کر مسلمانوں کا خون بہایا۔ بھارت میں اگرچہ سیکولر جمہوری نظام حکومت قائم ہے لیکن یہ سیکولرازم ایک پردہ ہے جس کے پیچھے مذہبی اقلیتوں کو ہندو اکثریت کے نقطہ نظر میں ڈھالا جا رہا ہے اور یہ جمہوریت بھی اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کرنے کی قائل نہیں۔ اس صورت حالات میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں رابطہ اور اتحاد کی ضرورت محسوس کی گئی ہے اور انہوں نے بعض امور میں مشترک لائحہ عمل اختیار کیا ہے۔

نائجیریا چودھویں صدی عیسوی سے ایک اسلامی ملک رہا ہے جس میں مسلمانوں کی مضبوط حکومتیں قائم ہوئیں اور انہوں نے علم وفن کو اسی طرح ترقی دی جس طرح دوسرے ممالک اسلامیہ میں یہ ترقی ہوئی۔ انیسویں صدی کے اواخر میں فرانس اور انگلستان نے اس علاقہ کو فتح کر لیا لیکن ۱۹۶۰ء میں اسے پھر آزادی مل گئی۔ اس وقت اقتدار عیسائیوں کے ہاتھ میں ہے لیکن مسلمان بھی اس میں شریک ہیں۔ اس ملک کو اسلامی کانفرنس کی تنظیم میں مبصر کا درجہ حاصل ہے۔ ابھی تک یہ مکمل رکن نہیں بنا۔ ملکی حالات کے لحاظ سے یہ مسلم اقلیت کا علاقہ نہیں ہے۔ اسلام یہاں نہایت قوی ہے اور مسلمان ساٹھ فی صد اکثریت میں ہیں۔ ایتھوپیا میں انیسویں صدی میں یورپی اقوام نے صلیبی جذبے سے کام لیتے ہوئے مسلم ریاستوں پر قبضہ کر کے مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ عیسائیوں کی متعصب حکومتوں کا سلسلہ شاہ ہیل ثلاثی کے خلاف ۱۹۷۴ء کے فوجی انقلاب تک جاری رہا۔ اس کے بعد سوشلسٹ حکومت قائم ہوئی جس نے مسلمانوں کو دبانے کے لیے روس اور کیوبا کے سپاہیوں کو بھی استعمال کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ اس ملک کے مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد نہیں ہے۔ مختلف تنظیمیں الگ الگ اہداف رکھتی ہیں اس لیے نقصان اٹھائے چلی جا رہی ہیں۔ تنزانیہ میں مسلمان خاصے منظم ہیں لیکن اقتدار عیسائیوں کے ہاتھ میں ہے اور حکومت مسلمانوں پر پابندیاں عائد کرتی ہے۔ ان کے تعلیمی اداروں کے کام میں رکاوٹ پیدا کی جاتی ہے اور اسلامی جماعتوں پر پابندی ہے تاہم مساجد اور مدارس کام کر رہے ہیں۔ یہاں کے مسلمان بھی اقلیت کے حکم میں نہیں آتے۔ کینیا کے حالات تنزانیہ کے مشابہ ہیں۔

فلپائن کا علاقہ مسلمانوں کے زیر اقتدار تھا جب سپین نے سولہویں صدی میں اس پر قبضہ کر لیا۔ عیسائی حکومت نے مسلمانوں کے لیے وہی پالیسی اپنائی جو اس نے اسپین میں ان کے ساتھ روا رکھی تھی۔ اس پالیسی کے نتیجہ میں ملک میں ظلم و تشدد کا دور شروع ہوا اور مسلمان اس کے خلاف جدوجہد پر مجبور ہوئے۔ اس زمانے سے کر آج تک مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان اس قدر کشیدگی ہے کہ وقتاً فوقتاً مسلح بغاوتوں اور فوجی مقابلوں کی نوبت آجاتی ہے۔ تاہم مسلمان اپنے حقوق سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔ تھائی لینڈ میں مسلمان اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں لیکن تھائی حکومت ان کو دبائے رکھنے پر تلی ہوئی ہے۔ کتنے مسلمان لیڈروں کو قتل کر دیا گیا۔ مسلمانوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے نام بدلیں اور تھائی نام رکھیں۔ ان کے تعلیمی اداروں کو تباہ کیا گیا اور ان کی زبان سے ملائی اثرات کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہاں بھی مسلمان اپنے حقوق سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہیں۔ انتہائی مشکل حالات کے اندر جس طرح مسلمانوں نے اپنے دین کو سنبھالا ہے یہ اسلام کی حقانیت اور عظمت کی ایک دلیل ہے۔ یہ دین دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں جس طرح پھیلا ہوا ہے خواہ بعض ریاستوں میں اس سے وابستہ لوگوں کی تعداد کتنی ہی کم ہو، اس سے اس کی آفاقیت کی شہادت ملتی ہے۔ یہ کسی خاص خطے یا خاص طبقے کا دین نہیں، یہ ہر اس شخص کا دین ہے جو اس کے بنیادی عقیدہ کو مانتا ہو اگرچہ اس کا تعلق کسی بھی رنگ اور نسل سے ہو۔ لہٰذا پوری دنیا مسلمانوں کی ہے اور مسلم اقلیتوں کے ہمدرد ہر جگہ موجود ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے مسلم اقلیتوں کی جن کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے ان میں سرفہرست اسلامی تعلیمات سے بے بہرہ ہونا ہے۔ اس کے علاوہ اسلام کے ساتھ وفاداری کا کمزور داعیہ اور ملی اتحاد کا فقدان وہ خطرناک بیماریاں ہیں جو ان کو مستقبل میں شدید نقصان پہنچا سکتی ہیں۔ ان کے نزدیک مسلم اکثریت کے ممالک ابھی تک مسلم اقلیتوں کے بارے میں صحیح پالیسی بنانے میں ناکام رہے ہیں۔ ان کے سفارت خانے ایسی غلطیاں کرتے ہیں جن کے نتیجے میں مسلم اقلیتوں کو بجائے فائدہ کے نقصان پہنچتا ہے۔ مثال کے طور پر سفارت کاروں کی کونسلیں بنا کر ان کو مساجد کا انتظام سونپنا، باہر سے اماموں کا تقرر کرنا اور غیر نمائندہ تنظیموں کی براہِ راست مالی امداد کرنا یہ تاثر دیتا ہے کہ یہ مسلمان اپنی دھرتی کے فرزند نہیں بلکہ بیرون ملک کے نمائندہ ہیں جن کی وفاداری مشکوک ہے۔ اس طرح کے تاثر نے ان مسلمانوں کو اپنے ہم وطنوں کے ساتھ معاملات میں مشکلات سے ہمکنار کیا ہے۔ سفارت خانوں کا تعلق سیاسی نوعیت کا ہرگز نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے ثقافتی، مذہبی اور معاشی نوعیت تک محدود ہونا چاہیے۔ مالی امداد صرف منظم اداروں کو مخصوص منصوبوں کے لیے دی جائے۔ بعض فرقوں یا غیر نمائندہ افراد کو امداد دینے سے اجتناب کیا جائے۔ ماضی میں مغربی ممالک کی بعض یونیورسٹیوں کے اسلامیات کے شعبوں کو مالی امداد دی گئی جو انہوں نے اپنے خلافِ اسلام منصوبوں کی تکمیل میں صرف کی۔ اسی طرح جو امداد آفت زدہ علاقوں کی مسلمان آبادی کے لیے

بعض بین الاقوامی اداروں کو دی گئی وہ عیسائی مشنریوں کے حوالے کر دی گئی اور مسلمان اس سے محروم رہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ مسلم اقلیتوں کی نمائندہ تنظیمیں قائم ہوں اور اس طرح کے مواقع پر مالی امداد ان کے محفوظ ہاتھوں میں جائے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اسلامی ممالک دوسری ریاستوں کے ساتھ اپنے روابط میں اس بات کو خاص اہمیت دیں کہ ان ریاستوں کا رویہ اپنی مسلم رعایا کے ساتھ کیسا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے مسلم اقلیتوں کو حوصلہ دلاتے ہوئے ان کو یہ پیغام دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مجاہد بنائیں اور اس جہاد میں اگر حالات ان کے لیے سازگار نہ ہوں تو وہ ہجرت کے لیے تیار رہیں۔ اس بارہ میں انہیں مکہ کے اولین مسلمانوں کا رویہ اپنانا چاہیے جنہوں نے کفر سے دب کر رہنے کے بجائے پہلے حبشہ کو اور پھر مدینہ منورہ کو ہجرت کی۔ یہاں معلوم نہیں کیوں فاضل مصنف اس حقیقت کو بھول گئے ہیں کہ صدر اول کے مسلمانوں کے لیے دین اصل سرمایہ تھا۔ وہ اس کا گہرا علم اور شعور رکھتے تھے۔ وہ اس کی خاطر دنیا کی ہر چیز کو ٹھکرا سکتے تھے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر صاحب کے اپنے تجزیہ کے مطابق اس وقت مسلمانوں کا سرفہرست مسئلہ دین سے بے بہرہ ہونا اور اس کے ساتھ وفاداری کا کمزور ہونا ہے۔ اس صورت حال میں ان کو جہاد اور ہجرت کی ترغیب دینے سے پہلے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ دین کو محض ثانوی حیثیت نہ دیں بلکہ اس کی خاطر قربانی کا جذبہ پیدا کریں۔ خود علم دین سیکھیں اور دوسروں کو سکھائیں۔ اس طرح ان کی جمعیت مضبوط ہوگی اور اپنی تنظیم کے ذریعے وہ مستقبل میں اپنی نسل کو بہتر ماحول دے سکیں گے۔

متدبّرِ قرآن
خالد مسعود

تفسیر سورۂ نساء (۳)

اے ایمان والو، جب تم خدا کی راہ میں نکلا کرو تو اچھی طرح تحقیق کر لیا کرو اور جو تمہیں سلام کرے اس کو دنیوی زندگی کے سامان کی خاطر یہ نہ کہو کہ تو مومن نہیں ہے۔ اللہ کے پاس بہت سامانِ غنیمت ہے تمہارا حال بھی پہلے ایسا ہی رہ چکا ہے۔ اللہ نے تم پر فضل فرمایا تو تحقیق کر لیا کرو۔[٤٣] جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔ ۹۴

مسلمانوں میں غیر معذور بیٹھ رہنے والے اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کرنے والے برابر نہیں ہیں۔[٤٤] مال و جان سے جہاد کرنے والوں کو اللہ نے بیٹھ رہنے والوں پر ایک درجہ فضیلت کا بخشا ہے۔ یوں دونوں سے اللہ کا وعدہ اچھا ہے لیکن اللہ نے مجاہدین کو بیٹھ رہنے والوں پر ایک اجرِ عظیم کی فضیلت دی ہے۔ ۹۵ اس کی طرف سے درجے بھی اور مغفرت و رحمت بھی۔ اور اللہ غفور رحیم ہے۔ ۹۶

جن لوگوں کی جان فرشتے اس حال میں قبض کریں گے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ہوئے[٤٥] ہیں وہ

---

[٤٣] اسلامی غزوات کا اصل مقصود فتوحات حاصل کرنا اور مالِ غنیمت جمع کرنا نہیں بلکہ مظلوم مسلمانوں کو کفار کے پنجہ سے چھڑانا تھا لہٰذا یہ بات کسی طرح گوارا نہیں کی جا سکتی تھی کہ کسی مسلمان کی جان خطرے میں پڑے۔ اس لیے یہ ہدایت دی کہ کسی علاقے پر حملہ کرنے سے قبل وہاں رہنے والے مسلمانوں کے متعلق پوری تحقیق کرو اور اگر کوئی مسلمان اپنے ایمان کی شہادت کے لیے تمہیں سلام کرے تو مالِ غنیمت کی طمع میں اس کے ایمان کا انکار نہ کرو۔

[٤٤] یہ ان تمام غیر معذور مسلمانوں کو جہاد پر ابھارا ہے جو اسلام کے مخلص تھے۔ جہاد میں عملاً حصہ نہ لینا اس صورت میں نفاق ہے جب آدمی اس سے جی چرائے، دوسروں کی ہمت پست کرے یا جہاد کی نفیرِ عام ہو جانے کے باوجود گھر میں بیٹھا رہے۔ اگر یہ صورت نہ ہو تو جہاد ایک فضیلت کا عمل ہے۔

[٤٥] اپنی جانوں پر ظلم سے مقصود یہاں ہجرت کی استطاعت کے باوجود دارالکفر میں پڑے رہنا ہے۔

ان سے پوچھیں گے کہ تم کس حال میں پڑے رہے۔ وہ جواب دیں گے ہم تو اس ملک میں بالکل بے بس تھے۔ وہ کہیں گے کہ خدا کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے۔ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔ ۹۷ البتہ وہ بے بس مرد، عورتیں اور بچے جو نہ تو کوئی تدبیر کر سکتے اور نہ کوئی راہ پا رہے ہیں۔ ۹۸ یہ لوگ توقع ہے کہ اللہ ان سے درگزر فرمائے۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔ ۹۹ اور جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بڑے ٹھکانے اور بڑی وسعت پائے گا اور جو اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کر کے نکلے گا، پھر اس کو موت آ جائے تو اس کا اجر اللہ کے ذمے لازم ہو گیا[٤٦] اور اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ۱۰۰

اور جب تم سفر میں نکلو تو اس امر میں کوئی گناہ نہیں کہ نمازیں قصر کرو،[٤٧] اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر تمہیں فتنہ میں ڈال دیں گے۔ بے شک یہ کافر تمہارے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔ ۱۰۱

اور جب تم ان کے درمیان موجود ہو اور نماز میں ان کی امامت کر رہے ہو تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ تمہارے[٤٨] ساتھ کھڑا ہو اور وہ اپنے ہتھیار لیے ہوئے ہو، پس جب وہ سجدہ کر چکیں تو وہ تمہارے

---

[٤٦] ان آیات میں دارالحرب کے مسلمانوں کو ہجرت پر ابھارا ہے۔ ہجرت یہ ہے کہ مسلمان ایک ایسے مقام کو جہاں اس کے لیے اپنے دین و ایمان پر قائم رہنا جان جوکھوں کا کام بن گیا ہو، چھوڑ کر ایک ایسے مقام کو منتقل ہو جائے جہاں اسے توقع ہو کہ وہ اپنے ایمان کی حفاظت کر سکے گا۔ ہجرت کا اجر آخرت میں تو جو ہے وہ ہے، دنیا میں بھی مہاجر کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص مدد فراہم ہوتی ہے۔ جب مہاجر کی نیت خالص اور ارادہ راسخ ہو تو ہجرت کی راہ میں اس کا پہلا قدم بھی منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔

[٤٧] قصر یہ ہے کہ جو نمازیں چار رکعت والی ہیں وہ دو رکعت پڑھی جائیں۔ مغرب اور فجر میں قصر نہیں ہے۔ قصر کی رخصت اصلاً سفرِ جہاد کے تعلق سے نازل ہوئی ہے۔ دوسرے سفروں میں اس کی حیثیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک صدقہ کی سی ہے۔ کافروں کے فتنہ کا حوالہ آیت کے موقعِ نزول کی اس علت کو ظاہر کر رہا ہے جس کے سبب سے یہ اجازت مرحمت ہوئی۔

[٤٨] یہ صلوٰۃ الخوف یعنی جنگ کے خطرات کے دوران نماز باجماعت کی شکل بتائی گئی جس میں نماز باجماعت کا مقصد بھی حاصل ہوتا ہے اور دفاع کا بھی۔ نیز صحابہ کرام اس صورت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا میں نماز ادا کرنے کی فطری آرزو بھی پوری کر سکتے تھے۔ اس دینِ فطرت میں توکل اور تدبیر، شجاعت و حکمت، تہوّر اور احتیاط کا ایسا معتدل امتزاج ہے کہ نماز بھی جہاد بن جاتی ہے۔

پیچھے ہو جائیں اور دوسرا گروہ آگے آئے جس نے ابھی نماز نہیں پڑھی ہے اور وہ تمہارے ساتھ نماز پڑھے اور یہ بھی اپنی حفاظت کا سامان اور اپنے اسلحہ لیے ہوئے ہوں۔ کافر یہ تمنا رکھتے ہیں کہ تم اپنے اسلحہ اور اپنے سامان سے ذرا غافل ہو تو وہ تم پر یکبارگی ٹوٹ پڑیں۔ اور اس بات میں تمہارے اوپر کوئی گناہ نہیں کہ اگر[۹۹] تمہیں بارش کے سبب سے تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو اپنے اسلحہ اتار دو البتہ اپنی حفاظت کا سامان لیے رہو۔ اللہ نے کافروں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے ۝ ۱۰۲

پس جب تم نماز ادا کر چکو تو اللہ کو یاد کرو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے۔ پس جب حالتِ اطمینان[۱۰۰] میں ہو جاؤ تو پوری نماز قائم کرو۔ بے شک نماز اہلِ ایمان پر وقت کی پابندی کے ساتھ فرض ہے ۝ ۱۰۳

اور دشمن کے تعاقب میں تھڑدلا پن نہ دکھاؤ۔ اگر تم دکھ اٹھاتے ہو تو آخر وہ بھی تو تمہاری ہی طرح دکھ اٹھاتے ہیں اور تم خدا سے وہ توقع رکھتے ہو جو توقع وہ نہیں رکھتے اور اللہ علم والا اور حکمت والا ہے ۝ ۱۰۴

ہم نے یہ کتاب تم پر حق کے ساتھ اتاری تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تمہیں دکھایا[۱۰۱] ہے۔ اور تم بدعہدوں کے حمایتی نہ بنو۔ اور اللہ سے مغفرت مانگو، بے شک اللہ

---

[۹۹] آیت کے الفاظ سے صلوٰۃ الخوف کی جو شکل متعین ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ امام قصر نماز دو رکعت ادا کرے اور مقتدیوں کے دونوں گروہ ایک ایک رکعت امام کے پیچھے اور ایک ایک رکعت بطور خود ادا کر کے اپنی نماز پوری کریں۔ امام کو دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہونے سے پہلے قدرے توقف کرنا پڑے گا۔ اس نماز کا تعلق خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی سے تھا۔ اس زمانے میں حالات کے تقاضے کے مطابق قیام جماعت کی جو شکل ممکن ہو وہ اختیار کی جا سکتی ہے۔

[۱۰۰] حالتِ خوف دور ہونے کے بعد اقامت صلوٰۃ کا حکم عود کر آئے گا یعنی پوری نماز، جماعت اور وقت کی پابندی کے ساتھ ادا کرنی ہوگی۔ اوقات کی پابندی اقامت صلوٰۃ کے شرائط میں سے ہے۔

[۱۰۱] 'جو دکھایا ہے' کے الفاظ اس رہنمائی کے لیے آئے ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے ہوتی۔ گویا پیغمبر کو وحی کے ذریعے سے جو رہنمائی ملتی ہے وہ گویا چشم سر سے حقائق کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے لیے اس سے ہٹ کر کوئی راہ اختیار کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے اس وجہ سے اب حق و باطل کے درمیان امتیاز کے لیے کسوٹی یہی ہے اس کسوٹی پر پرکھ کر تمہیں لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنا ہے کہ کون حق پر ہے کون باطل پر، کون مخلص ہے کون منافق۔

غفور رحیم ہے ۝ اور ان لوگوں کی وکالت نہ کرو جو اپنے آپ سے خیانت کر رہے[۱۰۲] ہیں۔ اللہ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو بدعہد اور حق تلف ہیں ۝ یہ لوگوں سے تو چھپتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپتے حالانکہ وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب کہ وہ ناپسندیدہ سرگوشیاں کرتے ہیں اور اللہ جو کچھ وہ کرتے ہیں سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے ۝ ۱۰۸

یہ تم ہو جنہوں نے دنیا کی زندگی میں ان کی مدافعت کی تو قیامت کے دن اللہ سے کون ان کی مدافعت کرے گا یا کون ان کا ذمہ دار بنے گا ۝ اور جو کسی بدی کا ارتکاب کرے یا اپنی جان پر کوئی ظلم ڈھائے، پھر اللہ سے مغفرت چاہے تو وہ اللہ کو بخشنے والا رحم کرنے والا پائے گا ۝ اور جو کسی بدی کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا وبال اسی پر آتا ہے اور اللہ علیم و حکیم ہے ۝ اور جو کسی غلطی یا گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، پھر اس کی تہمت کسی بے گناہ پر لگاتا ہے تو اس نے اپنے سر ایک بہت بڑا بہتان اور گناہ لیا ۝ ۱۱۲

اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک گروہ نے تو یہ ٹھان ہی لی تھی کہ تمہیں بے راہ کر کے رہے گا حالانکہ یہ اپنے آپ ہی کو بے راہ کر رہے ہیں، تمہارا کچھ نہیں بگاڑ رہے ہیں۔ اور اللہ نے تم پر کتاب و حکمت نازل فرمائی اور تمہیں وہ چیز سکھائی جو تم نہیں جانتے تھے اور اللہ کا تم پر بڑا فضل ہے ۝ ۱۱۳

ان کی سرگوشیوں کا زیادہ حصہ ایسا ہے جس میں کوئی خیر نہیں۔ خیر والی سرگوشی تو صرف اس کی ہے جو صدقہ کی صلاح دے یا کسی نیکی کی راہ سجھائے یا اصلاح ذات البین کی دعوت[۱۰۳] دے۔ جو اللہ کی رضا جوئی میں

---

[۱۰۲] یہاں بظاہر خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس میں عتاب کا رخ ان مسلمانوں کی طرف ہے جو منافقین کی حمایت کرتے تھے۔ قرآن مجید میں اس طرح کے جو خطاب وارد ہوئے ہیں بالعموم کلام کے تدریجی ارتقا سے ان کا اصل رخ بھی واضح ہو گیا ہے کہ خطاب فی الحقیقت کن سے ہے۔

خیانت اس بے وفائی کے لیے ایک معروف لفظ ہے جو بیوی اپنے شوہر سے کرتی ہے کہ اپنے شوہر سے کرتی ہے کہ اپنے آپ کو حبالۂ عقد میں تو کسی اور مرد کے دیتی ہے لیکن عشق کی پینگیں کسی اور کی طرف بڑھاتی ہے۔ اسی طرح منافقین اطاعت و وفاداری کا عہد تو اللہ اور رسول سے کرتے ہیں لیکن دم دوسروں کا بھرتے ہیں۔

[۱۰۳] آیت میں نجویٰ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی سرگوشی اور رازداری کے انداز میں کسی سے بات کرنے کے ہیں۔ اس میں بجائے خود تو برائی نہیں۔ ایسے مواقع ہو سکتے ہیں جہاں رازداری اور سرگوشی کا طریقہ ہی قرینِ مصلحت ہو۔ اس میں برائی یا بھلائی بات کی نوعیت سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر بات نیکی اور تقویٰ کی ہے تو وہ نجوائے خیر ہے اور اگر بات

ایسا کریں گے تو ہم ان کو اجرِ عظیم عطا فرمائیں گے ۞ اور جو کوئی راہ ہدایت واضح ہو چکنے کے بعد رسول کی مخالفت کرے گا اور مسلمانوں کے رستے کے سوا کسی اور راستے کی پیروی کرے گا تو ہم اس کو اسی راہ پر ڈالیں گے جس پر وہ پڑا اور اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بُرا ٹھکانہ ہے ۞ ۱۱۵

بے شک اللہ اس چیز کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے[۸۴]، اس کے نیچے جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا اور جو اللہ کا شریک ٹھہرائے گا وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا ۞ یہ اس کے سوا پکارتے بھی ہیں تو دیویوں کو اور پکارتے بھی ہیں تو شیطان سرکش[۸۵] کو ۞ اس پر اللہ کی پھٹکار ہے! اور اس نے کہہ رکھا ہے کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک معین حصہ ہتھیا کے رہوں گا ۞ ان کو گمراہ کرکے چھوڑوں گا، ان کو آرزوؤں کے جال میں پھنساؤں[۸۶] گا، ان کو سجھاؤں گا تو وہ چوپایوں کے کان کاٹیں[۸۷] گے اور ان کو سجھاؤں گا تو وہ خدا کی

شرارت اور فتنے کی ہے تو وہ بجائے شیطانی ہے۔ آیت کے الفاظ سے آپ سے آپ یہ بات نکل آئی کہ یہ لوگ جو سرگوشیاں کرتے ہیں اس میں لوگوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتے ہیں بمعروف کی بجائے منکر کی ترغیب دیتے ہیں اور مسلمانوں میں نفاق ڈالنے کی سازش کرتے ہیں۔

۸۴ اللہ کی ہدایت کے خلاف کوئی راہ اختیار کرنا، خدا کے رسول کے خلاف اپنی پارٹی کھڑی کرنا اور مومنین کے راستے سے الگ راہ نکالنا اپنی حقیقت کے لحاظ سے شرک ہے اور شرک تمام شر کا منبع ہے کیونکہ مشرک خدا سے کٹ کر اپنی باگ نفس اور شیطان کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ اس کے ہاں اگر کوئی نیکی ہوتی ہے تو وہ اتفاقی ہوتی ہے جس کا اصل منبع خیر خدا سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے خدا کے ہاں شرک کی معافی نہیں ہے جب تک اس سے توبہ نہ کی جائے۔

۸۵ شیطان درحقیقت مشرک کا امام اور داعی ہے۔ اس اعتبار سے ہر وہ دعا اور التجا اور ہر وہ عبادت و اطاعت جو کسی غیر اللہ سے یا کسی غیر اللہ کے لیے کی جا رہی ہے وہ بالواسطہ مشرک کے اس امام ہی سے اور اسی کے لیے ہوتی ہے۔

۸۶ مشرک قومیں بالعموم جھوٹی آرزوئیں رکھتی ہیں۔ مشرکوں کا عقیدہ تھا کہ ان کی دیویاں آخرت میں ان کی شفاعت کریں گی۔ یہود اس وہم میں مبتلا تھے کہ وہ خدا کے برگزیدہ بندوں کی اولاد اور جنت کے پشتینی حق دار ہیں۔ نصاریٰ کا عقیدہ ہے کہ خدا نے اپنے بیٹے کو ان کے تمام گناہوں کا کفارہ بنا دیا ہے۔ وغیرہ۔

۸۷ مشرک قومیں خاص جانوروں کے کان چیر کر اپنے فرضی معبودوں کے نام پر چھوڑتی ہیں۔ یہ اس کی طرف اشارہ ہے۔

بنائی ہوئی ساخت کو بگاڑیں[۸۸] گے۔ اور جو اللہ کے سوا شیطان کو اپنا کارساز بنائے تو وہ کھلی ہوئی نامرادی میں پڑا ۞ وہ ان کو وعدوں کے بہلاوے دیتا ہے، آرزوؤں میں پھنساتا ہے اور شیطان کے وعدے سرتاسر فریب ہیں ۞ ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ اور وہ اس سے گریز کی کوئی راہ نہیں پائیں گے ۞ ۱۲۱

اور جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے ہم ان کو ایسے باغوں میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کا وعدہ حق ہے اور اللہ سے زیادہ وعدے کا سچا کون ہو سکتا ہے ۞ ۱۲۲

آرزوئیں نہ تمہاری پوری ہونی ہیں نہ اہل کتاب کی۔ جو کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا اور وہ اپنے لیے اللہ کے مقابل کوئی کارساز اور مددگار نہ پا سکے گا ۞ اور جو نیکی کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہے تو یہی لوگ ہیں[۸۹] جو جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہ ہوگی ۞ ۱۲۴

اور باعتبار دین اس سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر دے درانحالیکہ خوب کار بھی ہو اور ابراہیم کی ملت کی پیروی کرے جو بالکل یکسو تھا اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست بنایا ۞ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے ۞ ۱۲۶

اور لوگ تم سے عورتوں کے باب میں فتویٰ پوچھتے[۹۰] ہیں کہہ دو کہ اللہ ان کے باب میں بھی اور اس حکم کے باب میں بھی جو تمہیں کتاب میں ان عورتوں کے یتیموں کے بارے میں دیا جا رہا ہے جن کو تم وہ نہیں دیتے جو ان

---

۸۸ اس سے مراد اس فطرت اللہ کو بدلنا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے تمام خلائق کو پیدا کیا ہے مثلاً توحید دین فطرت ہے لیکن شیطان اور اس کے ایجنٹوں نے اس کو شرک سے مسخ کیا۔ ضمناً بہت سی خرافات اس کے حکم میں آتی ہیں۔ مثلاً خصّی کا مرد بنانا یا مردوں کا عورت بننا یا عورتوں مردوں کو ناقابل اولاد بنانا وغیرہ۔

۸۹ منافقین اور اہل کتاب دونوں کی آرزوؤں کا ایک ساتھ ذکر کرکے یہ واضح کیا ہے کہ شرک، شفاعت اور خاندانی برگزیدگی کے بل پر جنت کے خواب دیکھنے والے سب ایک ہی دامِ فریب کے گرفتار ہیں۔ ان کی نجات سے متعلق جھوٹی آرزوئیں پوری ہونے والی نہیں ہیں۔ خدا کے ہاں کام آنے والی چیز ایمان اور عمل صالح ہے۔

۹۰ اسلامی معاشرہ کی تاسیس، تنظیم اور تطہیر سے متعلق اصولی باتیں اوپر بیان ہو گئیں۔ یہاں سے آگے خاتمہ سورہ کی آیات ہیں۔ آیت میں فتویٰ کا تعلق اسی سورہ کی آیات ۲ تا ۴ میں بیان کردہ احکام سے ہے۔ وہاں یتامیٰ کی مصلحت سے ان کی ماؤں سے نکاح کرنے کی اجازت چار کی قید، ادائے مہر اور عدل کی شرط کے ساتھ دی ہے۔ مہر اور عدل کی شرط ان لوگوں پر شاق گزری جو یتیموں کی مصلحت سے نکاح کرنا چاہتے تھے۔ ان کے سوالات کے جواب میں فرمایا کہ عام عورتوں کو بھی اور یتامیٰ کی ماؤں کو بھی ان کے مہر دو اور ان کے ساتھ عدل کا معاملہ کرو اور بے بس یتیموں کے لیے حق و انصاف کے قائم کرنے والے بنو۔

کے لیے لکھا گیا ہے لیکن ان سے نکاح کرنا چاہتے ہو اور بے سہارا بچوں کے باب میں یہ فتویٰ دیتا ہے کہ ان کے مرد و اور یتیموں کے ساتھ انصاف کرو اور جو مزید بھلائی تم کرو گے تو اللہ اس سے باخبر ہے ۝ اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے بیزاری یا بے پروائی کا اندیشہ ہو تو اس بات میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں آپس میں کوئی سمجھوتا کرلیں اور سمجھوتا ہی بہتر ہے۔ طبیعتوں میں حرص رچی بسی ہوئی[91] ہے۔ اور اگر تم حسن سلوک کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو جو کچھ کرو گے اللہ اس سے باخبر ہے ۝ ۱۲۸

اور تم پورا پورا عدل تو بیویوں کے درمیان کر ہی نہیں سکتے۔ اگرچہ تم اس کو چاہو بھی تو یہ تو نہ ہو کہ بالکل ایک ہی کی طرف جھک پڑو کہ دوسری کو بالکل معلقہ[92] بنا کر رکھ دو اور اگر تم اصلاح کرتے رہو گے اور خدا سے ڈرتے رہو گے تو خدا بخشنے والا اور مہربان ہے ۝ اور اگر وہ دونوں جدا ہو جائیں گے تو اللہ ان میں سے ہر ایک کو اپنی وسعت سے بے نیاز کر دے گا۔[93] اللہ بڑی سمائی رکھنے والا اور حکیم ہے ۝ ۱۳۰

اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ اور تم سے پہلے جن کو کتاب دی گئی ہم نے انہیں بھی ہدایت کی اور تم کو بھی کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور اگر تم کفر کرو گے تو یاد رکھو کہ اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور بھروسے کے لیے اللہ کافی ہے ۝ اگر وہ چاہے تو تم سب کو فنا کر دے اے لوگو،

---

91 حرص طبائع کی عام بیماری ہے جو باہمی تعلقات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ یا تو دونوں فریق ایثار پر آمادہ ہوں اور اگر ایک فریق لا علاج ہے تو دوسرا قربانی پر آمادہ ہو۔ لہٰذا عورت اگر خود اپنے حقوق کے معاملے میں ایسی رعایتیں شوہر کو دے دے کہ قطع تعلق کا اندیشہ رفع ہو جائے تو اسی میں بہتری ہے۔ البتہ فرمایا کہ ایثار و قربانی اور احسان و تقویٰ کا میدان مرد ہی کے شایانِ شان ہے۔

92 یہ عدل کی وضاحت فرمائی۔ عدل سے مراد یہ نہیں ہے کہ قلبی میلان اور ظاہری سلوک بالکل کانٹے کی تول برابر ہو۔ اس طرح کا عدل کوئی پوری نیک نیتی سے کرنا چاہے بھی تو نہیں کر سکتا۔ مطلوب جو چیز ہے وہ یہ ہے کہ ظاہری سلوک و معاملات میں ایسی روش رہے کہ دونوں کے حقوق ادا ہوتے رہیں۔ یہ نہ ہو کہ ایک بیوی بالکل معلقہ بن کے رہ جائے، نہ اسے دل کی محبت حاصل ہو نہ ظاہر کا سلوک، بلکہ سلوک اور حقوق میں توازن قائم کیا جائے۔

93 یعنی شریعت میں مطلوب تو یہی ہے کہ ازدواجی رشتہ ٹوٹنے نہ پائے لیکن اگر حالات مجبور ہی کر دیتے ہیں اور دونوں میں علیحدگی ہو جاتی ہے تو دونوں کا اصل رزاق اور کارساز بہرحال اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ ہر ایک کو اپنے فضل سے مستغنی کر دے گا۔

اور دوسروں کو لے آئے۔ اللہ اس چیز پر قادر[94] ہے ۝ جو دنیا کے صلے کا طلب گار ہے تو اللہ کے پاس دنیا اور آخرت دونوں کا صلہ موجود ہے اور اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے ۝ ۱۳۴

اے ایمان والو، حق پر جمے رہو[95] اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے، اگرچہ یہ شہادت خود تمہاری اپنی ذات، تمہارے والدین اور تمہارے قرابت مندوں کے خلاف ہی پڑے۔ کوئی امیر ہو یا غریب، اللہ ہی دونوں کا سب سے زیادہ حق دار ہے تو تم خواہش کی پیروی نہ کرو کہ حق سے ہٹ جاؤ اور اگر کج کرو گے یا اعراض کرو گے تو یاد رکھو کہ اللہ، جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے اچھی طرح باخبر[96] ہے ۝ اے ایمان والو، ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس نے پہلے اتاری۔ اور جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور روزِ آخرت کا انکار[97] کرے وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا ۝ بے شک جو لوگ ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر ایمان لائے، پھر کفر میں بڑھتے گئے[98]، اللہ نہ ان کی مغفرت فرمانے والا ہے اور نہ ان کو راہ دکھانے والا ہے۔ منافقوں کو خوش خبری دے دو کہ ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے ۝ ان کے لیے جو مسلمانوں کے مقابل میں کافروں کو دوست بنائے ہوئے ہیں۔ کیا ان کے ہاں عزت ڈھونڈ چاہتے ہیں، عزت تو سراسر اللہ کے لیے ہے ۝ ۱۳۹

---

94 یعنی ساری کائنات کا مالک ہونے کی وجہ سے وہی سزاوار ہے کہ اس پر بھروسہ کیا جائے اور زندگی کی باگ ڈور اس کے حوالے کی جائے۔ نافرمانی کی صورت میں اگر وہ چاہے تو سب کو فنا کر دے اور اس دنیا میں دوسری مخلوق لا بسائے۔ اس کا ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے۔

95 مراد حق و عدل کی وہ میزان ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی شکل میں عطا فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تمہارا ہر قول و فعل اسی باٹ اور اسی ترازو سے تولا ہوا ہو اور تم اسی پر قائم رہنے والے اور دنیا کے سامنے اللہ کی طرف سے اس کے دال اور گواہ ہو۔

96 میزانِ عدل کے مزید تقاضے بیان فرمائے کہ یہ صرف لینے ہی کے لیے نہیں بلکہ دینے کے لیے بھی ہے۔ یہ امیر اور غریب، قوی و بے اثر کے لیے الگ الگ نہیں کیونکہ اللہ کا حق اس کے سب بندوں پر یکساں قائم ہے۔ خواہشات اور بدعات آدمی کو اس کی پیروی سے ہٹانے کا باعث بنتی ہیں۔ اس نظامِ قسط کو بگاڑنے کی دونوں شکلوں سے بچنا فرض ہے، ایک اس کو مسخ کرنے کی کوشش اور دوسری زندگی کے معاملات میں اس کو اہمیت نہ دینے کی روش۔

97 یہ آیت اس کلمہ جامعہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو امتِ وسط اور قائم بالقسط امت کا کلمہ ہے یعنی بلا تفریق تمام انبیاء و رسل اور تمام آسمانی صحیفوں پر ایمان۔ اس کا ذکر سورہ بقرہ آیت ۱۳۶ میں گزر چکا ہے۔

98 یہ منافقین کا کردار ہے۔ اس میں ان کے تذبذب کی تصویر یا بیان واقعہ ہے۔ یہ منافقین بیشتر یہود میں سے

اور وہ کتاب میں تم پر یہ ہدایت نازل کر چکا ہے کہ جب تم سنو کہ آیاتِ الٰہی کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو تم ان کے ساتھ نہ بیٹھو تا آنکہ وہ کسی اور بات میں مشغول ہو جائیں[99] ورنہ تم بھی انہی کے مانند ہو جاؤ گے۔ اللہ منافقوں اور کافروں سب کو جہنم میں جمع کرنے والا ہے ۞ ان کو جو تمہارے لیے گردشوں کے منتظر ہیں۔ اگر تمہیں اللہ کی طرف سے کوئی فتح حاصل ہوتی ہے تو کہتے ہیں کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے اور اگر کافروں کو کوئی جیت ہو جائے تو کہتے ہیں کیا ہم تم پر چھائے نہیں رہے اور ہم نے مسلمانوں سے تم کو بچایا نہیں؟ تو اللہ ہی فیصلہ کرے گا تمہارے درمیان قیامت کے دن اور اللہ کافروں کو مومنوں پر کوئی راہ نہیں دے گا ۞ ۱۴۱

منافقین خدا سے چالبازی کرنا چاہتے ہیں حالانکہ چال وہ ان سے چل رہا ہے اور جب یہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو الکساتے ہوئے اٹھتے ہیں محض لوگوں کے دکھانے کے لیے اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں درمیان ہی میں لٹک رہے ہیں، نہ اِدھر ہیں نہ اُدھر[100]۔ اور جسے اللہ گمراہ کر دے تو تم ان کے لیے کوئی راہ نہیں پا سکتے ۞ ۱۴۳

اے ایمان والو، مسلمانوں کے مقابل میں کافروں[101] کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ کی صریح حجت قائم کرا لو ۞ ۱۴۴

تھے اور انہی کے زیرِ اثر بھی تھے۔ ایمان و کفر کا ایک کھیل یہ پہلے تورات کے ساتھ کھیل چکے تھے اور اب وہی کھیل اسلام کے ساتھ کھیل رہے تھے۔

[99] جن مجلسوں میں اللہ کے دین اور اس کی شریعت کا تمسخر ہو ان میں اگر کوئی مسلمان شریک ہو تو یہ اس کی بے حمیتی اور بے غیرتی کی دلیل ہے۔ اگر کوئی شخص ان میں شرکت کو اپنے لیے وجہِ عزت و شرف سمجھے تو یہ اس کی بے حمیتی کی ہی نہیں بلکہ اس کے مسلوب الایمان ہونے کی بھی دلیل ہے۔ اس قسم کے منافقوں کا حشر انہی لوگوں کے ساتھ ہوگا جن کے ساتھ خدا کے دین کے استہزا میں یہ شریک رہتے ہیں۔

[100] یعنی منافقین نہ مسلمانوں کے ساتھ ہیں نہ کفار کے ساتھ۔ دو گلّوں کے بیچ میں بھٹکنے والی بکری کے مانند کبھی اس گلّے میں شامل ہو جاتے ہیں کبھی دوسرے گلّے میں۔ ان کا طبیعت پر جبر کر کے نماز میں حاضر ہونا ان کی خدا سے چالبازی کی مثال کے طور پر بیان ہوا ہے۔ اس طرح کی نماز اللہ کے ساتھ صریح دھوکہ بازی ہے۔ یاد رہے کہ اُس دور میں مسجد کی حاضری ایمان اور کفر کے درمیان ایک علامتِ فارق کی حیثیت رکھتی تھی جو شخص بلا کسی عذرِ معلوم کے مسجد سے غیر حاضر رہتا اس کے لیے اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرانا ہی ناممکن ہو جاتا۔

[101] کافروں سے مراد یہاں وہ اہلِ کتاب ہیں جن سے منافقین کا ساز باز تھا۔

منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقے میں ہوں گے اور تم ان کا کوئی مددگار نہ پاؤ گے[102] ۞ البتہ جو توبہ اور اصلاح کریں گے اور اللہ کو مضبوطی سے پکڑیں گے اور اپنی اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر لیں گے وہ ایمان والوں کے ساتھ ہوں گے اور اللہ ایمان والوں کو اجرِ عظیم عطا فرمائے گا ۞ ۱۴۶

خدا کو تمہیں عذاب دینے سے کیا نفع ہے اگر تم شکر گزاری اختیار کرو اور ایمان لاؤ۔ اللہ تو بڑا قبول کرنے والا اور جاننے والا ہے ۞ ۱۴۷

اللہ بدزبانی کو پسند نہیں کرتا مگر یہ کہ کوئی مظلوم ہو[103]۔ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے ۞ اگر تم نیکی کو ظاہر کرو گے یا اس کو چھپاؤ گے یا کسی برائی سے درگزر کرو گے تو اللہ معاف کرنے والا اور قدرت رکھنے والا ہے ۞ ۱۴۹

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا کفر کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی راہ نکالیں ۞ یہی لوگ درحقیقت پکے کافر ہیں[104] اور ہم نے ان کافروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے ۞ اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی ان کو ان کا اجر دے گا اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے ۞ ۱۵۲

---

[102] یہ منافقین کو آخری تنبیہ ہے کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ کفرِ صریح کے بالمقابل ان کا یہ مذبذب ایمان بھی تو بہرحال کچھ قدر و قیمت رکھتا ہی ہے۔ فرمایا کہ منافقین کا درجہ کفار اور معاند کفار کے درجے سے بھی نیچے ہے۔

[103] جماعتی زندگی میں کسی گروہ کے اندر اگر کوئی خطرناک برائی جڑ پکڑ رہی ہو تو اس کا تدارک ضروری ہوتا ہے اور اس تدارک کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس برائی کی قباحت و شناعت، اس کے نتائج بد اور اس کے مرتکبین کے انجام کو اچھی طرح واضح کر دیا جائے لیکن ساتھ ہی اس امر کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ جماعت کے عام افراد عام صیغہ سے کہی ہوئی بات کو خود اپنے اندازے، قیاس اور گمان کی بنا پر معین اشخاص پر منطبق کرنا نہ شروع کر دیں۔ منافقین کے بارے میں جو سخت الفاظ کہے گئے ان کی رو سے یہاں یہ ہدایت فرما دی گئی کہ تعین اشخاص کے ساتھ برائی کا اظہار و اعلان صرف اس شخص کے لیے جائز ہے جس پر فی الواقع ظلم ہوا ہے۔ دوسروں کے لیے اللہ اس کو پسند نہیں کرتا۔

[104] یعنی پکے کافر تو درحقیقت یہ اہلِ کتاب ہی ہیں۔ یہ خدا پر ایمان اپنی شرائط پر لانا چاہتے ہیں نہ کہ خدا کی شرائط پر حالانکہ ایمان صرف وہ معتبر ہے جو خدا کے شرائط پر ہو۔ اگر ایمان کی شرطیں یہی مقرر کریں گے اور رسولوں کا انتخاب یہ اپنی ہی صوابدید پر کریں گے تو پھر خدا کی خدائی کہاں رہی۔ پھر تو خدا کا منصب انہوں نے خود ہی سنبھال لیا۔ اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ کفر صرف یہی نہیں ہے کہ کوئی شخص صریح لفظوں میں خدا اور رسولوں کا انکار کرے بلکہ یہ بھی کفر اور صریح کفر ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کو تو مانے لیکن اپنی شرائط پر۔

اہل کتاب[۱۰۵] تم سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم ان پر براہِ راست آسمان سے ایک کتاب اتار دو۔ یہ تعجب کی بات نہیں، موسیٰ سے تو انہوں نے اس سے بھی بڑا مطالبہ کیا تھا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ ہمیں تم اللہ کو کھلم کھلا دکھا دو۔ تو ان کو ان کی اس زیادتی کے باعث کڑک نے آ دبوچا۔ پھر نہایت واضح نشانیاں آ چکنے کے بعد انہوں نے گوسالے کو معبود بنا لیا۔ ہم نے اس سے درگزر کیا اور موسیٰ کو ہم نے نہایت واضح حجت عطا کی ۞

اور ہم نے ان کے اوپر طُور کو معلق کیا ان کے عہد کے ساتھ۔ اور ہم نے ان کو کہا کہ دروازے میں داخل ہو سر جھکائے ہوئے اور ان کو کہا کہ سبت کے معاملے میں حکم عدولی نہ کرنا۔ اور ہم نے ان سے ایک مضبوط عہد لیا ۞ ۱۵۴

پس بوجہ اس کے کہ انہوں نے اپنے عہد کو توڑا، بوجہ اس کے کہ انہوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا، بوجہ اس کے کہ انہوں نے انبیاء کو ناحق قتل کیا اور بوجہ اس کے کہ انہوں نے کہا کہ ہمارے دل تو بند ہیں — بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے تو وہ کم ہی ایمان لائیں گے ۞ — اور بوجہ ان کے کفر کے اور بوجہ ان کے مریم پر ایک بہتان عظیم لگانے ۞ اور بہ سبب ان کے اس دعوے کے کہ ہم نے مسیح، عیسیٰ بن مریم، اللہ کے رسول کو قتل کیا — حالانکہ نہ تو انہوں نے اس کو قتل کیا، نہ سولی دی بلکہ معاملہ ان کے لیے گھپلا کر دیا[۱۰۶] گیا۔ اور جو لوگ اس کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں وہ اس کے معاملے میں شک میں

---

۱۰۵ آگے کی دس آیات میں تاریخ بنی اسرائیل کے جن واقعات کا حوالہ ہے وہ بلا استثناء سب کے سب سورہ بقرہ آیات ۴۰ تا ۹۶ میں بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں ان کا حوالہ یہود و نصاریٰ کو تنبیہ کے لیے ہے اور تنبیہ اتنی سخت ہے کہ لفظ لفظ سے جوشِ غضب ابلا پڑ رہا ہے۔ یہ صرف فردِ قرارداد جرائم پر مشتمل ہے۔ جرائم کی فہرست کے بیچ میں جملہ معترضہ بھی آ گئے ہیں لیکن خبر حذف ہو گئی ہے۔ یہ اسلوب بیان متکلم کے زورِ بیان اور جوش، سامع کی ذہانت اور ہوش، دعوے کی قوت اور فیصلہ کے ظاہر و باہر ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔

۱۰۶ یعنی یہود جو کچھ کرنا چاہتے تھے وہ تو وہ کر نہ پائے البتہ صورت حالات ایسی بنا دی گئی کہ وہ یہی سمجھے کہ انہوں نے مسیح کو سولی دلوا دی ہے۔ یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ اس کی شکل کیا ہوئی البتہ انجیلوں کی روداد سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس وقت ملک پر رومیوں کی حکومت تھی، وہی تمام سیاسی و تعزیری اختیارات کے مالک تھے لیکن وہ حضرت عیسیٰ کو سولی دینے سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ وہ اس ظلم کی ذمہ داری اپنے اوپر لینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ گرفتاری اور سزا کے وقت کے حالات اتنے ہنگامہ خیز تھے کہ ان میں عوام کو ہر بات باور کرائی جا سکتی تھی اور وہ بڑی آسانی سے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ مان سکتے تھے۔ چنانچہ سولی کسی اور شخص کو دی گئی اور مشہور کر دیا گیا کہ حضرت مسیح ہی کو سولی دی گئی کیونکہ سیدنا مسیح کے کارناموں کی دھوم کے باوجود عوام ان سے اچھی طرح متعارف

پڑے ہوئے ہیں، ان کو اس بارے میں کوئی قطعی علم نہیں[۱۰۷] بس گمان کی پیروی کر رہے ہیں۔ قتل اس کو انہوں نے ہرگز نہیں کیا ۞ بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ غالب اور حکیم ہے ۞ ۱۵۸

اور اہل کتاب میں سے کوئی نہیں ہے جو اس کی موت سے پہلے اس کا یقین[۱۰۸] نہ کر لے اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہو گا ۞ ۱۵۹

پس ان یہودی کے ظلم کے سبب سے ہم نے بعض پاکیزہ چیزیں ان پر حرام کر دیں جو ان کے لیے حلال تھیں اور بوجہ اس کے کہ وہ اللہ کی راہ سے بہت روکتے ہیں اور بوجہ اس کے کہ وہ سود لیتے ہیں حالانکہ اس سے ان کو روکا گیا ہے۔ اور بوجہ اس کے کہ وہ لوگوں کا مال باطل طریقہ سے کھاتے ہیں[۱۰۹] اور ہم نے ان میں سے کافروں کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے ۞ البتہ ان میں جو علم میں راسخ اور صاحبِ ایمان ہیں وہ ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو تم پر اتاری گئی اور جو تم سے پہلے اتاری گئی اور خاص کر نماز قائم کرنے والے اور زکوٰۃ دینے والے اور اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھنے والے[۱۱۰]۔ یہ لوگ ہیں جن کو ہم اجر عظیم دیں گے ۞ ۱۶۲

نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انجیلوں سے ثابت ہے کہ اس واقعہ کے بعد حضرت مسیح کے شاگردوں نے ان کو دیکھا۔

۱۰۷ مراد نصاریٰ ہیں جنہوں نے ایک فرضی افسانے کو لے کر اس پر ایک پوری دیومالا تصنیف کر ڈالی جس میں بڑے اختلافات ہیں۔

۱۰۸ مطلب یہ ہے کہ آج یہ اہل کتاب قرآن اور نبی کی صداقت تسلیم کرنے کے لیے یہ شرط ٹھہراتے ہیں کہ وہ آسمان سے کتاب اترتی ہوئی دکھائیں تب وہ یقین کریں گے کہ قرآن فی الواقع اللہ کی کتاب اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) واقعی اللہ کے رسول ہیں لیکن وہ وقت بھی دور نہیں ہے جب یہ قرآن اور پیغمبر کی کہی ہوئی ایک ایک بات کو واقعات کی شکل میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور قرآن ان کے لیے جس رسوائی و نامرادی اور جس ذلت و شکست کی خبر دے رہا ہے وہ پیغمبر کے دنیا سے اٹھنے سے پہلے پہلے اس طرح ان کی آنکھوں کے سامنے آ جائے گی کہ اس کو جھٹلانا ان کے لیے ممکن نہیں رہے گا۔

۱۰۹ یعنی ایمان لانے میں ان کے لیے جو چیزیں مانع ہیں وہ دراصل ان کے جرائم ہیں۔ یہ ہمیشہ سے گردن کش اور نافرمان ہیں۔ اسی گردن کشی ہی کے سبب سے یہ ہمیشہ حق کی راہ میں روڑا بنے اور اسی کے سبب سے انہوں نے حرام خوری کے تمام دروازے کھول لیے۔ اس کردار کے لوگ معجزہ دیکھ کر بھی قرآن پر ایمان نہیں لائیں گے۔

۱۱۰ مراد وہ علماء ہیں جن کے قدم علم شریعت میں خوب جمے ہوئے، جو عقیدہ اور عمل میں راسخ اور کردار و اخلاق ہر پہلو سے جادۂ مستقیم پر استوار تھے۔ نیز وہ سلیم الفطرت لوگ جو یہود کے عام بگاڑ کے باوجود خدا کی ہدایت و شریعت پر قائم رہے۔ ایسے ہی لوگ بالآخر اسلام کی دعوت قبول کرنے والے بنے۔

ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی کی ہے جس طرح نوح اور اس کے بعد آنے والے نبیوں کی طرف وحی کی اور ہم نے ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب، اولادِ یعقوب، عیسٰی، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان پر وحی بھیجی اور ہم نے داؤد کو زبور عطا کی ۝ اور دوسرے بھی بہت سے رسولوں پر وحی بھیجی جن کا حال ہم تم کو پہلے سنا چکے ہیں اور بہت سے رسولوں کا حال نہیں سنایا اور موسیٰ سے تو اللہ نے کلام کیا ۝ اللہ نے رسولوں کو خوشخبری دینے والے اور ہوشیار کرنے والے بنا کر بھیجا تاکہ ان رسولوں کے بعد لوگوں کے لیے اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ اللہ غالب اور حکیم ہے ۝ ۱۶۵

پر اللہ گواہی دیتا ہے اس چیز کی جو اس نے تم پر نازل کی ہے۔ اس نے اس کو اپنے علم کے ساتھ نازل کیا ہے اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں اور گواہی کو تو اللہ ہی کافی ہے[111] ۝ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑے ۝ جن لوگوں نے کفر کیا اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ان کو تو خدا نہ بخشنے کا ہے اور نہ جہنم کے سوا، جس میں وہ ہمیشہ نہیں رہیں گے، ان کو کوئی اور رستہ دکھانے کا ہے ۝ اور اللہ کے لیے یہ بات آسان ہے ۝ ۱۶۹

اے لوگو، رسول تمہارے پاس تمہارے رب کے پاس سے حق لے کر آ گیا ہے۔ پس ایمان لاؤ، اسی میں تمہاری بہتری ہے اور اگر کفر پر جمے رہوگے تو یاد رکھو کہ اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے اور اللہ علیم وحکیم ہے ۝ اے اہلِ کتاب، اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ پر حق کے سوا کوئی اور بات نہ ڈالو۔[112] مسیح عیسیٰ ابن مریم

---

[111] یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ تمہارے مخالف تم پر نازل شدہ وحی کو نہیں مانتے بلکہ آسمان سے اتری ہوئی کھلی کتاب کا مطالبہ کر رہے ہیں نہ تو وحی دنیا میں ایسی انجانی چیز ہے جس کا تجربہ دنیا میں کبھی کو ہوا ہو اور نہ نبوت و رسالت ایسی اجنبی چیز ہے جس کا اظہار تمہی نے کیا ہو۔ وحی بھی دنیا میں تم سے پہلے آ چکی ہے اور رسول بھی بے شمار آ چکے ہیں۔ اگر ایک جانی بہچانی چیز سے لوگ بھڑکتے ہیں تو قصور تمہارا نہیں بلکہ خود انہی کا ہے۔ تمہارے اطمینان کے لیے تو یہ چیز بس کرتی ہے کہ اللہ اور اس کے فرشتوں کی شہادت تمہارے حق میں ہے۔

[112] غلو کا مفہوم یہ ہے کہ دین میں ایک چیز کا جو درجہ و مرتبہ یا جو وزن و مقام ہے اس کو بڑھا کر کچھ سے کچھ کر دیا جائے۔ جو حکم صرف استحباب کا درجہ رکھتا ہے اس کو فرض کا درجہ دے دیا جائے، جس کو اللہ نے نبی بنایا اس کو شریکِ خدا بنا ڈالا جائے، جس کی صرف تعظیم مطلوب ہے اس کی عبادت شروع کر دی جائے۔ نصاریٰ نے اپنے غلو کے سبب سے پورے دین کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ غلو کے دروازہ کو بند کرنے کے لیے فرمایا کہ اللہ کی طرف وہ بات منسوب نہ کرو جو اس نے نہیں فرمائی۔ ایسا کرنے سے شیطان کو دین میں گھسنے کی راہ ملتی ہے۔

تو بس اللہ کے ایک رسول اور اس کا ایک کلمہ ہیں جس کو اس نے مریم کی طرف القا فرمادیا اور اس کی جانب سے ایک روح ہیں[113]۔ پس اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور تثلیث کا دعویٰ نہ کرو[114]۔ باز آ جاؤ۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ معبود تو بس تنہا اللہ ہی ہے۔ وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے اولاد ہو، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ کارساز بس ہے ۝ اور مسیح کو ہرگز اللہ کا بندہ بننے سے عار نہ ہوگا اور نہ مقرب فرشتوں کو عار ہوگا اور جو اللہ کی بندگی سے عار کرے گا اور تکبر کرے گا تو اللہ ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا ۝ پس جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہوں گے تو ان کو تو ان کا پورا پورا اجر بھی دے گا اور اپنے فضل میں سے بھی ان کو مزید بخشے گا اور جنہوں نے عار اور تکبر کیا ہوگا ان کو دردناک عذاب دے گا اور وہ اللہ کے بالمقابل نہ کسی کو اپنا دوست پائیں گے نہ مددگار ۝ ۱۷۳

اے لوگو، تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے ایک حجت آ چکی ہے اور ہم نے تمہاری طرف ایک نورِ مبین[116] اتار دیا ۝ تو جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اس کو انہوں نے مضبوطی سے پکڑ لیا ان کو وہ اپنی رحمت اور اپنے فضل میں داخل کرے گا اور انہیں اپنی طرف سیدھی راہ کی ہدایت بخشے گا ۝ ۱۷۵

---

[113] یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں صحیح بات یہ ہے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں۔ ان کی ولادت اللہ تعالیٰ کے کلمہ کُن سے ہوئی ہے، جس کو اس نے مریمؑ کی طرف القا فرمادیا اور ان کو روح بھی خدا کی جانب سے عطا ہوئی۔ ان کی خارقِ عادت ولادت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنا پر ان کو خدائی کا درجہ دے دیا جائے۔

[114] عیسائیوں کا عقیدۂ تثلیث پال کی اختراعات میں سے ہے۔ اس عقیدے کی رو سے الوہیت میں باپ (اللہ تعالیٰ) بیٹا (عیسیٰ علیہ السلام) اور روح القدس تینوں شریک ہیں۔ پھر بھی یہ تین خدا نہیں بلکہ ایک خدا ہے۔ فرمایا کہ رسولوں پر ایمان لاؤ۔ ان کی تعلیم میں مسیحؑ سے لے کر آدمؑ تک کہیں تثلیث کا سراغ نہیں ملتا تو آخر یہ فتنہ تم نے کہاں سے گھڑ لیا۔

[115] غلو میں مبتلا ہونے کا بڑا سبب اشتباہ رہا ہے۔ لوگ کسی کو مان لیتے ہیں تو ان کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کو سب چیزوں اور تمام اشخاص سے بڑھ کر ثابت کر دکھائیں۔ عیسائیوں کو مسیح علیہ السلام کے بارے میں یہی فتنہ پیش آیا۔ ان کی اس ذہنیت کو سامنے رکھ کر فرمایا ہے کہ خدا کی بندگی کو تو مسیحؑ نے نہ عار سمجھا نہ سمجھیں گے، نہ روح القدس اور دوسرے مقرب فرشتے اس کو عار سمجھیں گے۔ یہ سب اپنے درجے اور مرتبے کو خوب جانتے ہیں۔

[116] مراد قرآن مجید ہے۔ وہ حجت ہے، اس کے اندر ہر شبہ، ہر اعتراض اور ہر سوال کا تشفی بخش جواب موجود ہے۔ وہ نورِ مبین ہے کہ عملی زندگی کے تمام نشیب و فراز میں حق و باطل کو واضح کر کے صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی فرماتا اور تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔

(باقی ص۱۴۱ پر)

امین احسن اصلاحی

جبر و اختیار کا مسئلہ
فلسفہ اور قرآن کی روشنی میں (۱)

انسان نے جب سے زندگی کے بنیادی مسائل پر غور کرنا شروع کیا ہے اسی وقت سے اس کے سامنے یہ سوال بھی رہا ہے کہ کیا وہ غیب کی طرف سے پہلے سے مقرر کی ہوئی ایک متعین ڈگر پر ہانک دیا گیا ہے جس کے رد و اختیار میں اس کا کوئی دخل نہیں یا وہ اپنے لیے خود راہ کا انتخاب کرتا یا اس کے انتخاب کرنے میں آزاد ہے۔ اگر پہلی صورت ہے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے اعمال کے نیک و بد ہونے یا ان پر عذاب و ثواب یا جزا و سزا مترتب ہونے کا کیا مطلب ہے۔ ایسی صورت میں تو اسے شجر و حجر اور حیوانات کی طرح غیر مسئول ہونا چاہیے۔ اگر دوسری صورت ہے یعنی یہ کہ وہ آزاد ہے تو یہ طے ہونا چاہیے کہ اس آزادی کی کیا نوعیت ہے۔ اگر محدود ہے تو اس کے حدود کیا ہیں، اگر غیر محدود ہے تو اس سے خدا کی وحدانیت پر حرف آتا ہے اور کائنات میں ثنویت لازم آتی ہے۔ اس کا کیا جواب ہے؟

اس مسئلہ میں اہل فکر و فلسفہ کے دو گروہ بڑے نمایاں ہیں۔ ایک گروہ تو ان فلسفیوں کا ہے جو جبر محض کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلے سے غیب کی طرف سے انسان کے لیے ایک ڈگر متعین کر دی گئی ہے، وہ اس پر چلنے پر مجبور ہے، اس کے لیے اس سے انحراف کا کوئی امکان نہیں۔ یہی گروہ اکثریت میں ہے لیکن یہ عجیب تضاد ہے کہ انسانوں کی غالب اکثریت اپنے عمل میں خود مختارانہ اور مطلق العنان رویہ اپناتی ہے مگر قائل جبریت کے فلسفہ کی ہے۔ دوسرا گروہ ان فلسفیوں کا ہے جو طبعی قوانین کی حد تک تو جبر کو مانتے ہیں لیکن اخلاقی دائرہ میں انسان کو آزاد کہتے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان کے اندر نیکی اور بدی کا شعور موجود ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان ان دونوں میں سے کسی بھی راہ کا انتخاب کرنے میں آزاد ہے۔ اسی طرح خدا نے جن چیزوں کے کرنے یا نہ کرنے کی ہدایت کی ہے ان پر اس کے ہاں پرسش

بھی ہوگی۔ اگر پرسش ہونے والی ہے تو ان چیزوں میں لازماً انسان کو اختیار بھی حاصل ہے لیکن جن معاملات میں کوئی پرسش نہیں ان میں اختیار کا بھی کوئی سوال نہیں۔ ہم مشہور فلسفیوں کی آراء کا خلاصہ ذیل میں پیش کرتے ہیں تاکہ ان کا نقطہ نظر سمجھنے میں آسانی ہو۔

یونان کے ابتدائی عہد کے مفکرین کا خیال تھا کہ دنیا پر چند جابر قوتوں کی حکمرانی ہے جن کے سامنے انسان بے بس ہے۔ یہی قوتیں انسان کی تقدیر کا فیصلہ کرتی ہیں۔ اس لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ ان قوتوں کے سامنے سر جھکا دے اور اپنی تقدیر پر صابر و شاکر رہے۔

فیثاغورث :

فیثاغورث (PYTHA GORAS) (۵۸۰ ق۔م —— ۵۰۰ ق۔م) اور اس کے شاگردوں کا خیال ہے کہ دنیا ایک بہت بڑی مشین کی مانند ہے جس کا ایک پرزہ انسان بھی ہے۔ مشین کا چکر چل رہا ہے اور انسان مشین کے پرزہ کی حیثیت سے اپنے حصہ کا کام کیے جا رہا ہے۔ ایک پرزے کا عمل مشین کے مجموعی عمل کے تابع ہوا کرتا ہے اس لیے کسی پرزے کی آزادی اور اختیار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا انسان کی آزادی کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

ہیراقلیطس :

ہیراقلیطس (HERACLITUS) (۵۳۵ ق۔م —— ۴۷۵ ق۔م) مکمل جبریت کا قائل ہے اس کا کہنا ہے کہ کائنات کا نظام ایسے بے لچک قانون کے مطابق چل رہا ہے جس کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ کائنات کی ہر چیز، جس میں انسان بھی شامل ہے، اس قانون کی پابندی کرنے پر مجبور ہے۔ دانشمندی اسی میں ہے کہ انسان اپنی اس حیثیت کو خوش دلی سے قبول کرکے اپنی قسمت پر قانع ہو جائے اور خود مختاری کے خبط میں مبتلا نہ ہو۔

سوفسطائی فلاسفہ :

'SOPHISTS' ان فلسفیوں نے کائنات کی بجائے انسان کو اپنے غور و فکر کا محور بنا لیا۔ انہوں نے دیکھا کہ انسان کے اندر بے پناہ قوتیں اور صلاحیتیں موجود ہیں اور دنیا کا گل سرسبد بھی انسان ہی ہے اس لیے انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ انسان چند قوتوں یا قوانین کا تابع محض نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ ان فلسفیوں کی رائے

واضح نہیں لیکن وہ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اپنی قسمت کو بنانے یا بگاڑنے میں انسان کا کوئی دخل نہیں ہوسکتا۔ ان کا کہنا ہے کہ خواہ انسان اپنی ازلی تقدیر کو بنانے یا بگاڑنے پر قادر نہ ہو لیکن وہ اپنی کوشش سے اپنے معاشرہ کا کامیاب فرد بن سکتا ہے۔ چونکہ انسان اپنے معاشرہ میں اپنے ارادہ کے مطابق اپنی تقدیر کو بنانے پر قادر ہے اس لیے انسان کو تقدیر کے ہاتھوں میں کھلونا قرار نہیں دیا جا سکتا۔

سقراط :

سوفسطائیوں کے خیالات نے بعد کے فلسفیوں پر گہرا اثر ڈالا اور انہوں نے بھی انسان ہی کو اپنے غور و فکر کا محور بنایا اور اس بات پر غور کرنا شروع کیا کہ اس کائنات میں انسان کا کیا مقام ہے۔ سقراط (SOCRATES) (۴۷۰ ق م ——— ۳۹۹ ق م) وہ پہلا فلسفی ہے جس نے کہا کہ شجر و حجر، ثوابت و سیاروں پر غور کرنے کی بجائے انسان اپنے کو پہچانے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ قدرت نے اس کو کس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اور اس کو کن صلاحیتوں سے مسلح کیا ہے۔ سقراط نے کہا کہ ان سوالوں کا صحیح جواب معلوم ہونے کے بعد انسان اپنی صلاحیتوں کو اس مقصد کے لیے استعمال کر سکے گا جو اس کا مقصد تخلیق ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ دنیا میں نیک بن کر رہے گا۔ اگر ان سوالوں کا صحیح جواب نہ معلوم ہوسکا تو وہ سیدھی راہ سے ہٹ جائے گا۔ یعنی ان سوالوں کے صحیح اور غلط جوابوں پر انسان کے اچھے اور برے ہونے کا انحصار ہے۔ انسان اپنی فہم و فکر سے ان سوالوں کے مختلف جواب حاصل کر کے اپنے لیے مختلف راہیں متعین کر سکتا ہے اس لیے انسان آزاد اور خود مختار ہے کہ چاہے تو وہ نیکی کی راہ اختیار کرے اور چاہے تو برائی کی راہ پر چل نکلے۔

افلاطون :

افلاطون (PLATO) (۴۲۸ ق م ——— ۳۴۸/۳۴۷ ق م) جبریت کا مخالف اور انسان کی آزادی کا قائل ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ خدا نے کائنات کو ایک مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس نے انسان کو اس لیے بنایا ہے کہ وہ تخلیق کائنات کے مقصد کو پورا کرے۔ انسان اگر عقل کی رہنمائی میں چلے تو اس مقصد کو پورا کر سکتا ہے لیکن عقل پر جذبات اور خواہشات کا غلبہ ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے وہ دانشمندی سے ہٹی ہوئی راہ اختیار کر کے تخلیق کائنات کے مقصد کو شکست بھی دے سکتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان جو راہ چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ افلاطون کی رائے میں نیک بننے کے لیے بھی ارادہ اور اختیار کی آزادی ضروری

ہے کیونکہ اگر انسان نیکی کی راہ پر چلنے پر مجبور ہے یا اس کی جبلت میں نیک بننا موجود ہے تو پھر انسان آزاد نہ ہوا۔ انسان اسی صورت میں نیک کہلا سکتا ہے جب نیکی اور بدی دونوں راہیں اس کے سامنے کھلی ہوئی ہوں لیکن وہ بری راہ پر چلنے کی خواہش پر قابو پا لے اور نیک راہ اختیار کر لے۔

ارسطو :

ارسطو (ARISTOTLE) (۳۸۴ ق م ——— ۳۲۲ ق م) کے نزدیک انسان کو ارادہ اور اختیار کی آزادی حاصل ہے اور انسان اچھا یا برا بننے پر مجبور نہیں۔ انسان کا سب سے بڑا شرف اس کی عقل ہے لیکن انسان اپنے ارادہ اور اختیار سے عقل کی رہنمائی کو نظر انداز کر کے جذبات کی پیروی کر سکتا ہے۔ افلاطون کی طرح ارسطو کا بھی یہ خیال ہے کہ جس دنیا پر تقدیر کی حکمرانی ہو وہ نیک دنیا نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ایسی دنیا میں انسان کو اپنے اعمال کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ پس انسان کو جب تک ارادہ اور اختیار کی آزادی حاصل نہ ہو اس وقت تک اس پر اچھا یا برا ہونے کا حکم نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ اچھا آدمی وہ ہے جو اپنے ارادہ سے صحیح راہ اختیار کرے اور برا آدمی وہ ہے جو جان بوجھ کر غلط راہ اختیار کرے۔

ابیقوری فلاسفہ :

ابیقورس (EPICURUS) اور اس کے ہم خیال دوسرے فلسفی جبریت کے مخالف ہیں۔ دیمو قریطس (DEMOCRITUS) کی رائے میں انسان ایٹم سے مل کر بنتا ہے جب یہ ایٹم منتشر ہو جاتے ہیں تو انسان ختم ہو جاتا ہے۔ ایٹم قوت ارادی کے مالک ہوتے ہیں اور اپنی مرضی کے مطابق حرکت کرتے ہیں جس کو کوئی خارجی قوت کنٹرول نہیں کرتی چونکہ انسان ایٹم سے مل کر بنتا ہے اس لیے وہ بھی اپنی مرضی کے مطابق حرکت کر سکتا ہے لہٰذا اس کو ارادہ اور اختیار کی آزادی حاصل ہے۔ ابیقورس کے نزدیک انسان اپنی تقدیر خود بنا اور بگاڑ سکتا ہے۔ وہ دانشمندی اور اچھائی کی راہ بھی اختیار کر سکتا ہے اور اپنے نفس کا غلام بن کر بھی رہ سکتا ہے۔

رواقی فلاسفہ :

زینو (ZENO) اور دوسرے رواقی (STOICS) فلسفی جبریت کے قائل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دنیا پر خدا کی حکمرانی ہے اور دنیا اور اس کی ہر چیز خدا کے ارادہ سے وجود میں آئی۔ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کی

مرتب ہوتا ہے، کوئی واقعہ محض اتفاق سے پیش نہیں آتا۔ ازل سے ابد تک کے تمام واقعات علت و معلول کی زنجیر کی کڑیاں ہیں جس کی ایک کڑی انسان بھی ہے۔ اس لیے انسان کے تمام افعال ایسے عوامل کا نتیجہ ہیں جن پر انسان کا کوئی کنٹرول نہیں۔ ان پر صرف خدا کا کنٹرول ہے۔ اس لحاظ سے تقدیر اور خدا کا ارادہ ایک ہی چیز ہے۔ انسان قوانین فطرت کی پابندی کرنے پر مجبور ہے البتہ اس کو اتنی آزادی ضرور ہے کہ ان قوانین کی پابندی خوش دلی سے کرے یا بد دلی سے کرے۔ رواقی فلسفی جبریت کے اس فلسفہ کو اس کے منطقی نتیجہ تک پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ کیونکہ جب اخلاقیات کا سوال سامنے آیا تو ان کو جبریت کے فلسفہ میں ترمیم کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ انھوں نے کہا کہ انسان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اخلاقی قوانین کی پابندی کرے اور عقل کے تقاضوں کے پیش نظر خیر اعلیٰ کے حصول کی کوشش کرے یا وہ اپنی خواہشوں کا غلام بن کر رہے۔ ان فلسفیوں کے نزدیک انسان جب اپنے نفس پر قابو پا لیتا ہے تو وہ آزاد ہو جاتا ہے۔

فیلو :

فیلو (PHILO) (۳۰ ق م ——— ۵۰ ء) نے یہودیت اور یونانی فلسفہ میں تطابق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے نزدیک مادہ شر کی بنیاد ہے اور روح ملکوتی صفات رکھتی ہے۔ روح میں مادہ کے ساتھ جذبی کشش بھی موجود ہے۔ جب روح مادہ یا انسانی جسم میں داخل ہوتی ہے تو اس میں ایک طرف شر کی آمیزش ہو جاتی ہے اور دوسری طرف انسان میں بعض ملکوتی صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ روح خدا ہی کا حصہ ہے لیکن وہ خدا کے احکامات کو ماننے یا ان کو مسترد کرنے میں آزاد ہے۔ خدا انسان کے اعمال کو مکمل طور پر کنٹرول نہیں کرتا بلکہ اس نے انسان کو اس بات کا مکلف بنایا ہے کہ چاہے تو وہ اپنی خواہشوں کا غلام بن جائے یا نفس پر قابو پا کر روح کو مادہ کی جکڑ بندیوں سے نجات دلائے تاکہ روح خدا کی ذات میں دوبارہ ضم ہو جائے جس کا وہ حصہ ہے۔ فیلو کے نزدیک اس طرح انسان اپنی تقدیر خود بنانے پر قادر ہے۔

پلوٹینس :

پلوٹینس (PLOTINUS) (۲۰۴ء ——— ۲۶۹ء) نے بھی کم و بیش وہی بات کہی ہے جو فیلو نے کہی تھی۔ اس کے نزدیک بھی روح مکمل طور پر آزاد ہے لیکن مادہ میں داخل ہونے کے بعد اپنی آزادی سے محروم ہو جاتی ہے البتہ اس میں اس قید خانہ سے آزادی حاصل کرنے کی صلاحیت برقرار رہتی ہے۔ انسان چاہے تو روح کو مادہ کی قید سے نجات دلا سکتا ہے اور اگر چاہے تو اس کو شیطان کے ہاتھ فروخت بھی کر سکتا ہے

اس کے معنی یہ ہیں کہ مادہ کو روح پر مکمل اختیار اور کنٹرول حاصل نہیں ہوتا۔ اس طرح یہ فلسفی بھی اختیار کا قائل ہے

ابتدائی دور کے عیسائی متکلمین (APOLOGISTS) بھی فیلو اور پلوٹینس کے نقطۂ نظر کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کی تخلیق کے وقت روح کو اچھے برے کی تمیز سکھائی گئی اور اس کو اختیار دیا گیا کہ وہ دونوں میں سے جس کو چاہے منتخب کر سکتی ہے۔ اسی اختیار کی وجہ سے ارواح خدا سے جدا ہو کر مادہ میں داخل ہو گئیں۔ چونکہ مادہ شر کی بنیاد ہے اس لیے شر روح کے ساتھ چپک گیا۔ البتہ انسان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی روح کو جسم کے قید خانہ سے نجات دلانے کے لیے خدا کی طرف مائل ہو یا پھر اپنے حال میں مست رہے۔ بعض عیسائی متکلمین نے یہ استدلال بھی پیش کیا کہ حضرت عیسیٰؑ دنیا میں انسان کو گناہوں سے نجات دلانے آئے تھے۔ پس انسان کو گناہ کرنے میں آزاد ماننا ہوگا ورنہ اس کو گناہ سے نجات دلانے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں۔ وہ اسی صورت میں مجرم قرار پا سکتا ہے جب وہ گناہ کا راستہ اختیار کرنے میں آزاد ہو۔ ان عیسائی متکلمین کے نزدیک خدا خیر مجسم ہے اس لیے وہ دنیا میں شر کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ شر کی ذمہ داری انسان پر عائد ہوتی ہے اور اس پر یہ ذمہ داری اسی صورت میں عائد ہو سکتی ہے کہ وہ آزاد اور خود مختار ہو۔

سینٹ آگسٹائن :

سینٹ آگسٹائن (SAINT AUGUSTINE) (۳۵۴ء ——— ۴۳۰ء) کے زمانے تک انسان کے ازلی گناہگار ہونے کا عقیدہ عیسائیوں میں پھیل گیا تھا لہٰذا اس کے فلسفہ کی بنیاد بھی اسی عقیدہ پر ہے اور وہ مکمل جبریت کا قائل ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب خدا نے آدم کو پیدا کیا تو اس کو ارادہ اور اختیار کی آزادی بھی عطا کی لیکن آدم نے گناہ کا راستہ اختیار کیا جس کی وجہ سے نہ صرف آدم بلکہ ان کی تمام ذریت اس نعمت سے محروم ہو گئی۔ اب تمام انسان شر کے غلام اور گناہ کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے بعض انسانوں کو نجات کے لیے منتخب کر لیتا ہے اور دوسروں کو ان کے گناہ کی پاداش میں عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ خدا کا یہ انتخاب اس کی اپنی مرضی سے ہوتا ہے۔ اس پر انسان کے اعمال اثر انداز نہیں ہو سکتے۔
بعد میں آنے والے متعدد عیسائی متکلمین آگسٹائن ہی کے ہمنوا ہیں۔ لیکن بعض اختیار کے بھی قائل ہیں۔

ابی لارڈ :

عیسائی متکلمین ابی لارڈ (ABELARD) (۱۰۷۹ء ——— ۱۱۴۲ء) آگسٹائن کے نقطۂ نظر سے ہٹ کر یہ کہتا ہے کہ اختیار کے بغیر گناہ کا وجود ممکن نہیں۔ گناہ وہ عمل ہے جس کو انسان گناہ سمجھتے ہوئے

کرے۔ لیکن اگر کوئی شخص نیت تو نیک کام کی رکھتا ہو لیکن اس سے برا کام سرزد ہو جائے تو یہ گناہ نہیں ہوگا۔ لہٰذا انسان کو نیک اور بدے انتخاب میں آزاد ہونا چاہیے۔

تھامس اکوناس :

مشہور عیسائی متکلم اکوناس (THOMAS AQUINAS) (۱۲۲۵ء — ۱۲۷۴ء) انسان کی آزادی کا قائل ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان میں ارادہ اور عقل موجود ہے۔ اس کا ارادہ عقل کے تابع ہے۔ عقل جب کسی عمل کے بابت ہونے کی گواہی دیتی ہے تو انسان اس عمل کو کرنے کا ارادہ بھی کر سکتا ہے اور اس کو مسترد بھی کر سکتا ہے۔ چونکہ آدم کا گناہ انسان کے ساتھ چپک گیا ہے جس سے انسان صرف خدا کے فضل ہی سے چھوٹ سکتا ہے اس لیے جب خدا کسی انسان کو گناہ سے نجات دینے کا ارادہ کرلے تو انسانی ارادہ کو اس سے تعاون کرنا چاہیے۔ خدا کو معلوم ہے کہ بعض لوگ اس کے فضل و کرم کی پیشکش قبول نہیں کریں گے اس لیے یہی لوگ ازلی گناہگار ہیں۔

نشاۃ ثانیہ :

نشاۃ ثانیہ کے دور میں اہل دانش نے کلیسا کے تسلط سے انسان کو نجات دلانے کے لیے کائنات پر آزادانہ غور و فکر شروع کیا۔ گلیلیو، کپلر، نیوٹن اور دوسرے سائنس دانوں نے دریافت کیا کہ یہ کائنات چند سائنسی اور بے لچک قوانین کے تحت چل رہی ہے جن میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں۔ انسان اس کائنات کا ایک جزو ہونے کی وجہ سے ان قوانین کی پابندی کرنے پر مجبور ہے۔ یہ لوگ صحیح معنوں میں فلسفی نہیں ہیں بلکہ طبیعیات کے ضابطوں اور علت و معلول کے قواعد سے مرعوب ہو کر جبر کے قائل ہوئے ہیں۔

فرانسس بیکن :

بیکن (FRANCIS BACON) (۱۵۶۱ء — ۱۶۲۶ء) نے مصلحت آمیز فلسفہ پیش کیا۔ اس نے کہا کہ انسان کائنات پر غور و فکر کرکے ان قوانین کو معلوم کر سکتا ہے جو کائنات کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی عقل کو ماضی کے خداؤں کی غلامی سے نجات دلا سکتا ہے اور اپنی کھوئی ہوئی آزادی حاصل کر سکتا ہے۔ انسان کو مذہبی قوانین کی پاسداری کرنی چاہیے خواہ ان قوانین میں کوئی معقولیت نظر نہ آئے۔ کیونکہ انسان آزاد نہیں ہے بلکہ خدا کی مرضی کا تابع ہے۔

تھامس ہابس :

ارادہ اور اختیار کی آزادی کے تصور کو ہابس نے احمقانہ قرار دیا۔ اس نے کہا کہ کائنات چند مشینی قوانین کے تابع ہے۔ کائنات کا حصہ ہونے کی وجہ سے انسان ان قوانین کی پابندی کرنے پر مجبور ہے۔ انسان کے اندر متضاد خواہشوں کی کش مکش جاری رہتی ہے جو اس کو غور و فکر کرکے ایک رویہ اختیار کرنے کا فیصلہ کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہ فیصلہ اس کا ارادہ کہلاتا ہے جو انسان کو عمل پر ابھارتا ہے۔ لیکن اس ارادہ کے پیچھے علت و معلول کا ایک لامتناہی سلسلہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کا فیصلہ یا ارادہ آزادانہ نہیں ہوتا بلکہ علت و معلول کا نتیجہ ہوتا ہے۔ ہابس (THOMAS HOBBES) (۱۵۸۸ — ۱۶۷۹) کے نزدیک اگرچہ انسان عمل کرنے میں آزاد ہے لیکن اس کے فعل کی بنیاد جس ارادہ پر ہوتی ہے وہ دوسرے عوامل کا نتیجہ ہوتا ہے اس لیے انسان کو ارادہ اور اختیار کی آزادی حاصل نہیں اور وہ مشینی قوانین کا تابع ہے۔

ڈیکارٹ :

ڈیکارٹ (RENE DESCARTES) (۱۵۹۶ء — ۱۶۵۰ء) نے اپنے زمانہ کے مشینی نظریات، خدا، روح اور آزادی کے تصورات میں مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے مادہ اور عقل کو دو مختلف چیزیں قرار دیا۔ اس نے جسم کو کائنات کا حصہ کہا جس پر مشینی قوانین کا اطلاق ہوتا ہے جن میں علت و معلول کا قانون بالا و درست ہے۔ علت و معلول کی کڑیاں ایک دوسرے سے اس طرح پیوستہ ہیں کہ گزرے ہوئے واقعہ کی بنیاد پر اگلے واقعہ کی پیشگوئی کی جا سکتی ہے۔ لیکن عقل یا روح پر مشینی قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا۔ یہ آزاد اور خود مختار ہیں۔ مثال کے طور پر عقل کو غور و فکر کرنے، خدا سے محبت کرنے یا نہ کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ وہ جسم کو اپنی مرضی کے مطابق عمل پر ابھار سکتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اختیار اور ارادہ کی صفت انسان کی عقل یا روح کے اندر موجود ہے اور جسم اس پر بالواسطہ طور پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی قوت ارادی کو جسم کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے۔

سپینوزا :

سپینوزا (BARUCH SPINOZA) (۱۶۳۲ء — ۱۶۷۷ء) مکمل جبریت کا قائل ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ دنیا کا ہر واقعہ علت و معلول کی زنجیر کی ایک کڑی ہے۔ اس لیے کوئی واقعہ آزادانہ طور پر ظہور

میں نہیں آتا۔ چونکہ انسان کو یہ تمام کڑیاں نظر نہیں آتیں اس لیے وہ اس خوش فہمی میں رہتا ہے کہ اس کو اختیار اور ارادہ کی آزادی حاصل ہے۔ ارادہ اس کی عقل کے تابع ہے اس لیے اس کو آزاد نہیں کہا جا سکتا۔

جان لاک:

جان لاک (JOHN LOCKE) (۱۶۳۲ء—۱۷۰۴ء) کے نزدیک انسان کی آزادی اور خود مختاری کا سوال ایک فضول سوال ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی سوال ہے جیسا یہ پوچھا جائے کہ نیچ بونا چوکور ہے یا گول۔ وہ کہتا ہے کہ ارادہ ایک قوت کا نام ہے جو کسی فعل کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اگر کوئی شخص غور کرنے کے بعد ایک فعل کو دوسرے فعل پر ترجیح دیتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ شخص ارادہ رکھتا ہے۔ اسی طرح آزادی بھی ایک قوت ہے جو یہ فیصلہ کرتی ہے کہ انسان اپنے ارادہ کو پورا کرے یا نہ کرے۔ خدا نے انسان کے اندر کچھ خواہشات رکھی ہیں جو خواہش سب پر غالب ہوتی ہے انسان اس کو پورا کرنے کے لیے ارادہ اور آزادی کی ان دو قوتوں کو استعمال میں لاتا ہے۔

ڈیوڈ ہیوم:

ہیوم کے نزدیک انسان کی خواہش اور اس کے عمل میں علت و معلول کا تعلق ہے۔ اسی طرح دنیا کے دوسرے واقعات بھی علت و معلول کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ دنیا کے واقعات مضبوطی سے اس زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں جبکہ انسان کی خواہش اور عمل میں یہ تعلق اتنا مضبوط نہیں ہے۔ ہیوم (DAVID HUME) (۱۷۱۱—۱۷۷۶) کے خیال میں انسان کے اعمال اس کے کردار سے جنم لیتے ہیں۔ جب انسان کے اعمال اس کے اپنے ازلی کردار کا نتیجہ ہوں تو وہ آزاد ہے لیکن اگر وہ کسی خارجی دباؤ کی وجہ سے کوئی عمل کرنے پر مجبور ہو جائے تو وہ آزاد نہیں ہوگا۔

لائبنز:

لائبنز (LEIBNITZ) (۱۶۴۶ء—۱۷۱۶ء) کے نزدیک کسی خواہش کے حصول کی شعوری کوشش کا نام ارادہ ہے یعنی انسان کی خواہش اس کے ارادہ کا تعین کرتی ہے۔ انسان کو معلوم ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے، اسی لئے وہ اس کے حصول کا ارادہ کرتا ہے۔ لیکن انسان کا یہ ارادہ صرف اسی حد تک آزاد ہے کہ سب سے زیادہ قوی خواہش کا انتخاب کر سکے۔ لائبنز انسان کو اپنی خواہشوں کے خلاف کسی فعل کو کرنے

کا فیصلہ کرنے میں آزاد نہیں مانتا۔ اس کے نزدیک وہ غالب ترین خواہش کو اختیار کرنے اور اس کے حصول کی کوشش کرنے پر بھی مجبور ہے۔

عام طور پر جو فلسفی روشن خیال کہلاتے ہیں وہ مکمل جبریت کے قائل ہیں۔ اس سلسلہ میں والٹیئر VOLTAIRE خاص طور پر قابل ذکر ہے جو شروع میں انسان کے ارادہ کی آزادی کا قائل تھا لیکن آخری عمر میں وہ مکمل جبریت کا حامی ہو گیا۔ اس نے لکھا ہے "میں جو چاہتا ہوں اگر وہ کر سکوں تو آزاد ہوں" لیکن کیا میں یہ چاہنے میں بھی آزاد ہوں؟"

اس دور کے دوسرے فلسفیوں جان ٹولینڈ (JOHN TOLAND) ڈیوڈ ہارٹلے (DAVID HARTLEY) جوزف پریسٹلے (JOSEPH PRIESTLEY) لامیترے (LAMATTRIE) بیرن ڈی ہالباخ (BARON D' HALBACH) کے نزدیک انسان ایک پیچیدہ مشین ہے جس میں ارادہ نام کی کوئی چیز نہیں۔ کائنات کے اندر مختلف قوتوں کے درمیان برابر کشمکش جاری ہے۔ انسان ان کے رحم و کرم پر ہے۔ اس کے اندر ایسی کوئی طاقت یا اختیار نہیں کہ وہ ان قوتوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر سکے۔ اس کے برعکس ردسو نے اس بات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ انسان مختلف طاقتوں کے ہاتھوں میں کھلونا ہے۔ اس نے کہا کہ انسان کا اصل جوہر اس کا سائنسی دماغ نہیں بلکہ اس کا قلب ہے اور انسان اپنی آزادی کے تقاضوں کے مطابق زندگی گزارنے کی جد و جہد کرنے میں آزاد ہے۔

عمانویل کانٹ:

کانٹ (IMMANUEL KANT) (۱۷۲۴ء—۱۸۰۴ء) کا کہنا ہے کہ تجربات اور سائنس کی دنیا تو مشینی اور علت و معلول کی دنیا ہے جس میں نہ ہی آزادی کا کوئی ثبوت ملتا اور نہ ہی تجربات کے ذریعہ انسان کی آزادی کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سائنس سے بلند تر ایک حقیقت موجود ہے اور وہ ہے انسان کا اخلاقی وجود۔ انسان کے اندر نیکی اور بدی کا شعور یہ ظاہر کرتا ہے کہ تجربات سے پرے بھی ایک عالم ہے جس میں ارادہ کی آزادی پائی جاتی ہے اور جہاں انسان اچھی یا بری راہ اختیار کرنے میں آزاد ہے۔ کانٹ کے نزدیک انسان کو اپنی اخلاقی زندگی کے تحفظ کے لیے بھی آزادی پر یقین رکھنا ضروری ہے۔ سائنس کی دنیا میں تو انسان علت و معلول کے جال میں پھنسا ہوا ہے جہاں مایوسی کے سوا اور کچھ نہیں لیکن اگر انسان اپنی زندگی کو بہتر بنانا چاہتا ہے تو ہر شخص کو اس کے فعل کا ذمہ دار قرار دینا ضروری ہے۔ مزید برآں زندگی میں معنویت اور مقصدیت بھی اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب یہ سمجھا جائے کہ ہر شخص ہر کام اپنی مرضی کے مطابق کرتا

ہے۔ اس نے کہا کہ انسان کا اخلاقی شعور اس کی آزادی کا تقاضہ کرتا ہے۔

فختے:

فختے (JOHANN GOTTLIEB FICHTE) (۱۷۶۲ء — ۱۸۱۴ء) نے بھی اس خیال کی تردید کی کہ انسان علت و معلول کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان کا ارادہ یا خودی علت و معلول کی زنجیر کی کوئی کڑی نہیں بلکہ اس کا ارادہ ہی اس کی تمام سرگرمیوں کی بنیاد ہے۔ انسان کی دنیا خارجی عوامل سے نہیں بنتی بلکہ اس کے ارادہ یا خودی (میں) سے بنتی ہے۔ یہ خودی کامل خودی یعنی خدا کے ارادہ کا حصہ ہے انسان جو کچھ کرتا ہے وہ مشیت الٰہی ہوتی ہے۔ چونکہ مشیت الٰہی مکمل طور پر آزاد ہے اس لیے انسان کا ارادہ بھی آزاد ہے۔ جہاں تک اس اعتراض کا تعلق ہے کہ مشیت الٰہی کے تابع ہونے کی وجہ سے انسان کا ارادہ آزاد کیونکر ہوا تو اس نے اس کا جواب یوں دیا کہ انسان کو اس بات کے انتخاب کی آزادی ہے کہ وہ شعوری طور پر اپنے ارادہ کو رضائے الٰہی کا تابع بنا دے یا لاشعوری طور پر اس کے ہاتھ میں کھلونا بن جائے۔

ہیگل:

ہیگل (GEORG WILHELM FRIEDRICH HEGEL) (۱۷۷۰ء — ۱۸۳۱ء) یہ مانتا ہے کہ کائنات کا ارتقا جاری ہے تاکہ ازل سے اس کے اندر جو کچھ پوشیدہ ہے وہ مکمل طور پر ظاہر ہو سکے۔ جس طرح گلاب کے بیج میں ابتدا ہی سے گلاب پوشیدہ ہوتا ہے اور بیج کے ارتقا کے ساتھ ساتھ گلاب ظاہر ہونا شروع ہو جاتا ہے اور آخر کار بیج مکمل طور پر گلاب کا پھول بن جاتا ہے۔ اسی طرح کائنات میں آزادی اور خود مختاری ازل سے مخفی ہے اور یہ ایسے معاشرہ میں اپنی کامل شکل میں ظاہر ہوگی جس میں انسان کو مکمل آزادی حاصل ہو۔ اس کے نزدیک ترقی اسی صورت میں ہوگی جب انسان کے اندر آزادی کا شعور ترقی پا جائے۔ ہیگل کے نزدیک انسان اپنی مخفی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں مکمل طور پر آزاد ہے۔

ہربرٹ:

ہربرٹ (JOHN FRIEDRICH HERBERT) (۱۷۷۶ء — ۱۸۴۱ء) کو انسان کے اندر کسی قسم کی آزادی نظر نہیں آئی۔ اس نے انسانی ذہن کی سائنسی طرز پر توضیح کرنے کی کوشش کی۔ اس نے کہا کہ انسان کے افعال چند مقررہ اور بے لچک قوانین کے تابع ہوتے ہیں جن کی انسان پابندی کرنے پر مجبور ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان کا ہر فعل سائنس کے بے لچک قوانین کی طرح مختلف قوانین کے تابع ہوتا ہے۔ اس

لیے انسان کو کسی قسم کی کوئی آزادی حاصل نہیں۔

آرتھر شوپنہار:

شوپنہار (ARTHUR SCHOPENHOUR) (۱۷۸۸ء — ۱۸۶۰ء) کا کہنا ہے کہ کائنات کا مرکز اس کا ارادہ ہے۔ یہ ارادہ ہر چیز میں پایا جاتا ہے اور یہی ہر چیز کے بقا کا ضامن ہے۔ لیکن اس کے نزدیک زندہ رہنے کی خواہش یا انا کا شعور ہی دنیا میں تمام جدوجہد، مصائب اور شر کی بنیاد ہے اور ارادہ انسان کو خود غرض بنا دیتا ہے۔ اس لیے انسان اپنے ارادہ کو دبا کر ہی خوش اور مطمئن رہ سکتا ہے۔

جان سٹورٹ مل:

مل (JOHN STUART MILL) (۱۸۰۶ء — ۱۸۷۳ء) کا کہنا ہے کہ کائنات میں اگر مکمل جبریت ہو تو نیکی اور بدی کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔ بلاشبہ انسانی افعال بہت سے عوامل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ انہی عوامل میں سے ایک انسان کی خواہش بھی ہے۔ لیکن انسان اپنی خواہش کے خلاف بھی کسی فعل کا ارادہ اور اس کے لیے جدوجہد کر سکتا ہے۔ انسان کا یہی وصف اس کو اپنے اعمال کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ اس لیے اخلاقی میدان میں انسان آزاد اور اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔

ٹامس ہل گرین:

گرین (۱۸۳۶ء — ۱۸۸۲ء) کے نزدیک انسان اپنے تجربات کی روشنی میں اچھائی اور برائی کا فیصلہ کرتا اور اپنی زندگی بہتر بنانے کے متعلق سوچتا ہے اور جدوجہد کرتا ہے۔ ارادہ اور اس کی تکمیل کے لیے جدوجہد کی صلاحیت کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے اخلاقی اعمال کا ذمہ دار ہے۔ اس لیے انسان آزاد ہے اور اس کو اپنے اعمال کی ذمہ داری قبول کرنی چاہیے۔

ولیم جیمز:

جیمز (WILLIAM JAMES) (۱۸۴۲ء — ۱۹۱۰ء) کے نزدیک انسان کی فطرت کے اندر بعض بنیادی باتوں پر یقین کرنے کا داعیہ موجود ہے۔ یہی داعیہ اصل حیثیت رکھتا ہے۔ انسان کو جامد قوانین اور حالات کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔ اس لیے انسان کو آزاد ہونا چاہیے۔ اس نے کہا کہ انسان اپنے نظریات اور ان کے لیے

جد و جہد کرنے میں آزاد ہے۔

جان ڈیوی :

ڈیوی (JOHN DEWY) (۱۸۵۹ء — ۱۹۵۲ء) کہتا ہے کہ انسان غور و فکر کرتا ہے، منصوبے بناتا ہے، فیصلے کرتا ہے اور حالات و واقعات کا تجزیہ کرکے مستقبل کا اندازہ لگاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے افعال کے ذریعہ دنیا کے حالات کو تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے ارادہ اور اختیار کے معاملہ میں آزاد اور خود مختار ہے۔

اہل فلسفہ کی آراء پر تنقید

فلسفیوں کا ایک بڑا گروہ، جس میں قدیم فلسفی، رواقی فلسفی، پندرھویں اور سولھویں صدی کے سائنس دان، وحدت الوجودی فلسفی اسپنوزا اور آزاد خیال والٹیر شامل ہیں، جبریت کا قائل ہے۔ پیش کردہ دلائل کے لحاظ سے ان کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اب ہم ان کے دلائل کا جائزہ لیں گے۔

انسان کے مشین کا پرزہ ہونے کی دلیل :

پہلا گروہ ان فلسفیوں کا ہے جو انسان کو ایک بڑی مشین کے پرزہ کی حیثیت دیتے ہیں۔ ان کا نمائندہ فلسفی فیثا غورث ہے۔ اس کی رائے میں مشین کا چکر چل رہا ہے اور انسان اس کا پرزہ ہونے کی وجہ سے اپنا مقررہ کام کرنے پر مجبور ہے۔ چونکہ پرزہ کا ہر عمل مشین کے مجموعی عمل کے تابع ہوا کرتا ہے اس لیے کسی پرزے کی آزادی اور اختیار کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

ہمارے نزدیک ان فلسفیوں کو کائنات کے مشاہدہ میں زبردست مغالطہ ہوا ہے۔ مشین کا ایک پرزہ دوسرے کی اور دوسرا پرزہ تیسرے کی مدد کرتا ہے جس سے مشین کا پورا چکر چلتا ہے لیکن اس کائنات کے انسان کی حیثیت کے مشاہدے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ کائنات کی ہر چیز انسان کی خدمت میں لگی ہوئی ہے اس کے لیے سورج بھی سرگرم ہے اور چاند بھی منور ہے۔ زمین کی گردش بھی اسی کی ضرورت کے مطابق ہے۔ ابر و ہوا اس کے لیے اڑتے پھر رہے ہیں، گرمی اور سردی میں اس کے مصالح ملحوظ ہیں۔ زمین اپنے خزانے اسی کے لیے اگل رہی ہے۔ معلوم ہوا کہ دنیا کی ہر چیز انسان کی خادم ہے لیکن انسان کی بابت یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کسی کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ مشاہدہ سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں اس کی حیثیت گل سرسبد کی ہے۔ وہ سب

کا مخدوم ہے اور کسی کا خادم نہیں۔ لہٰذا جب تک یہ بات ثابت نہ کی جائے کہ انسان واقعی دوسری اشیاء کی خدمت پر مجبور ہے، ان فلاسفہ کی دلیل میں کوئی وزن نہیں جو انسان کو مشین کا ایک پرزہ قرار دے کر اسے مجبور محض سمجھتے ہیں۔

کائنات کے بے لچک طبعی قوانین سے استدلال :

جبر کے قائل فلسفیوں کے دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ جس طرح دنیا طبیعیات کے بے لچک قوانین کے تحت چل رہی ہے انسان بھی ان ہی بے لچک قوانین کے تابع ہے اس وجہ سے اس کے لیے آزادی اور خود مختاری کا سوال بے معنی ہے۔ اس گروہ کا نمائندہ فلسفی ہیراقلیطس ہے۔

یہ فلسفی یہ بات کہنے پر اس لیے مجبور ہوئے ہیں کہ یہ انسان کے اندر صرف جان یا نسمہ کے قائل ہیں اور روح کا کوئی تصور ان کے پاس نہیں ہے۔ ان کے خیال میں جس طرح جانوروں کے اندر جان پائی جاتی ہے اسی طرح انسانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ انسان ایک بیل کی طرح زندگی کی گاڑی کھینچتا ہے اور آخر کار ایک دن گردش روزگار اس کو فنا کر دیتی ہے۔ لہٰذا جس طرح ہر حیوان طبیعیاتی قوانین کے تابع ہے اسی طرح انسان کو بھی ان کا تابع ہونا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ جان رکھنے کے لحاظ سے انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں۔ جانور کے جسمانی اجزا وہی ہوتے ہیں جو انسان کے ہیں۔ دونوں یکساں طور پر بیمار ہوتے ہیں اور ایک وقت آتا ہے جب وہ مرجاتے ہیں۔ کوئی انسان اگر یہ چاہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے تو وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ زندگی اور موت کے لحاظ سے انسانی اور حیوانی جسم دونوں بے لچک طبعی قوانین کے تابع ہیں۔

لیکن انسان کا یہ نہایت حقیر تصور ہے کہ وہ جان رکھتا ہے اور اس طرح وہ دوسرے جانوروں کی مانند ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جان کے علاوہ اس کے اندر روح بھی موجود ہے جو فنا نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ زندہ رہتی ہے کیونکہ وہ طبعی قوانین کے تابع نہیں۔ روح ایک ملکوتی نور ہے۔ یہ روٹی سے نہیں بلکہ خدا کے کلمہ سے زندہ رہتی ہے۔ یہ عقل سے مسلح اور ایک نور یزدانی سے منور ہے اسی لیے اس کے اندر نیکی اور بدی کا تصور موجود ہے اور جب یہ تصور موجود ہے تو اس کو نیکی یا بدی کی راہ پر چلنے کا اختیار بھی لازماً حاصل ہونا چاہیے۔ پس انسان کو دوسرے جانوروں کی مانند ایک جانور تصور کرنا ایک واضح حقیقت کا انکار ہے۔

علت و معلول کی جکڑ بند کا نظریہ :

جبر محض کے مدعی فلسفیوں کے تیسرے گروہ کا کہنا ہے کہ ازل سے ابد تک تمام واقعات علت و معلول

کی ایک طویل زنجیر کی کڑیاں ہیں ۔ انسان بھی اس زنجیر کی ایک کڑی ہے ۔ اس وجہ سے اس کے اعمال ایسے عوامل کا نتیجہ ہیں جن پر انسان کو کوئی کنٹرول نہیں ۔ اس گروہ کا نمائندہ فلسفی زینو (ZENO) ہے ۔

اس دلیل کا ایک جواب تو مشہور جرمن فلسفی کانٹ نے دیا ہے ۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان علت و معلول کی زنجیر میں بندھا ہوا قیدی نہیں ہے کیونکہ وہ بہت سے افعال اپنے ارادہ سے انجام دیتا ہے ۔ زندگی میں معنویت اور مقصدیت اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے جب یہ سمجھا جائے کہ انسان اپنی مرضی کے تحت کام کرتا ہے ۔ مزید برآں انسان کے اندر جو اخلاقی شعور ہے وہ اس کے ارادہ کی آزادی کا تقاضا کرتا ہے انسان کے اندر شعور کا موجود ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنی راہ منتخب کرنے میں آزاد اور اپنی مرضی کے افعال سرانجام دینے کا اختیار رکھتا ہے ۔

ہمارے نزدیک اس بات سے انکار کی ضرورت نہیں کہ انسان علت و معلول کی زنجیر میں بندھا ہوا ہے البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علتِ اولیٰ جو تمام معلولوں کا سرچشمہ ہے کیا کسی ایسے معلول کو وجود میں لانے سے قاصر ہے جو ایک خاص دائرہ میں اپنے ارادے سے کام کر سکے ؟ حقیقت یہ ہے کہ انسان اگرچہ ایک معلول ہے لیکن خالق نے یہ ایک ایسا معلول پیدا کیا ہے جو اپنے ارادہ سے بہت سے کام کرتا اور بہت سے اعمال کی علت بنتا ہے جس طرح بارش خاص قوانین کے تحت ہوتی ہے لیکن اپنے فیض سے زمین ، ہوا اور ہر چیز کو متاثر کرتی ہے اسی طرح انسان بھی ایک ایسا معلول ہے جو دوسری چیزوں کے لیے خیر و برکت کا ذریعہ بنتا ہے ۔ اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ یہ تسلیم نہ کیا جائے کہ انسان ایک ایسا معلول ہے جو اپنے دائرہ میں آزاد ہے ۔ خاص طور پر اس صورت میں جب وہ اپنے نفس میں خیر و شر کا شعور بھی رکھتا ہے ، خیر کو اختیار کرنے اور شر سے بچنے اور دوسرے کو بچانے کا داعیہ بھی رکھتا ہے ۔

والٹیئر کا نقطۂ نظر :

اب فرانس کے مشہور مفکر والٹیئر کی اس بات پر بھی غور کر لیجیے کہ " میں جو چاہوں اگر کر سکوں تو آزاد ہوں لیکن کیا میں یہ چاہنے میں بھی آزاد ہوں ؟

والٹیئر کو دراصل مغالطہ زیر بحث آزادی کے مفہوم کو سمجھنے میں ہوا ہے ۔ اس کا خیال ہے کہ مطلق آزادی زیر بحث ہے یعنی یہ کہ اگر میں چاہوں تو بادشاہ ہو جاؤں ، دریا کا رخ موڑ دوں ، آسمان سے تارے توڑ لاؤں وغیرہ ۔ ظاہر ہے کہ یہ آزادی زیر بحث نہیں ہے اور نہ ہی اس آزادی کو کوئی عاقل پسند کر سکتا ہے ۔ ایسا اختیار تو صرف خالقِ کائنات کی شان ہے ۔ یہاں جو سوال زیر بحث ہے وہ یہ ہے کہ کیا نیکی یا بدی کی راہ اختیار

کرنے میں انسان آزاد ہے یا اس کو ایک خاص ڈگر پر چلنے پر مجبور کر دیا گیا ہے جو اس کے لیے مقدر کر دی گئی ہے ۔ اس آزادی کو چاہنے کا جہاں تک تعلق ہے تو اس میں اگر کوئی رکاوٹ ہو سکتی ہے تو انسان کے اپنے نفس کی طرف سے ہو سکتی ہے اور اگر انسان چاہے تو اس کا مقابلہ بھی کر سکتا ہے ۔ مضبوط ارادے اور نیکی کے عزم کے ساتھ وہ نفس کی اس رکاوٹ کو دور کر سکتا ہے ۔

نیکی کی راہ اختیار کرنے میں خارج سے بھی رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے ۔ مثلاً کوئی بادشاہ جبر کرتا ہے اور نیکی کی راہ اختیار کرنے پر کوڑے لگوا دیتا ہے تو انسانوں میں کتنے ہی لوگ ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے حق اور نیکی کی خاطر مصیبتیں برداشت کی ہیں اور ان اذیتوں سے ڈر کر نیکی سے دستبردار نہیں ہوئے ۔ فرض کر لیجیے کہ ایک شخص تکالیف کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تو اس کا نتیجہ یہ نہیں نکلتا کہ وہ طبعاً نیک یا بد کو اختیار کرنے میں آزاد نہ تھا بلکہ یہی کہا جائے گا کہ اس نے جس راہ کو درست سمجھا اس پر چلنے کا حوصلہ نہ رکھتا تھا ۔ ایسے لوگوں کے لیے مذہب بھی رخصت دیتا ہے اور معاشرہ بھی انہیں معذور قرار دیتا ہے ۔

(جاری ہے)

(ترتیب : محبوب سبحانی)

بقیہ : تفسیر سورۂ نساء (۳)

وہ تم سے[117] فتویٰ پوچھتے ہیں ۔ کہہ دو اللہ تمہیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے ۔ اگر کوئی شخص مرے ۔ اس کے کوئی اولاد نہ ہو ، اس کے ایک بہن ہو تو اس کے لیے اس کے ترکہ کا نصف ہے اور وہ مرد اس بہن کا وارث ہوگا اگر اس بہن کے کوئی اولاد نہ ہو ۔ اور اگر بہنیں دو ہوں تو ان کے لیے اس کے ترکہ کا دو تہائی ہوگا اور اگر کئی بھائی بہن مرد عورتیں ہوں تو ایک مرد کے لیے دو عورتوں کے برابر حصہ[118] ہے ۔ اللہ تمہارے لیے اس کی وضاحت کرتا ہے کہ مبادا تم گمراہی میں پڑ جاؤ اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے ۔ ۱۷۶

---

[117] یہ توضیحی آیت بطور ضمیمہ خاتمہ سورہ پر لگائی گئی ہے ۔ وراثت کے اصل احکام آیت ۱۲ میں گزر چکے ہیں ۔

[118] کلالہ سے مراد وہ مورث ہے جس کے نہ اصول میں کوئی ہو نہ فروع میں ، صرف بھائی بہن وغیرہ ہوں ۔ اگر آیت ۱۲ کے حکم کو صرف اخیافی بہن کے ساتھ مخصوص مان لیا جائے تو اس توضیحی حکم کے بعد کلالہ کی وراثت کے حکم کا ہر پہلو واضح ہو جاتا ہے ۔

افاداتِ فراہی

ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی

مولانا فراہیؒ کے قلمی حواشی الاتقان فی علوم القرآن پر (۳)

(۵۴) اگر "یَآ اَیُّھَا النَّبِیُّ" (اے نبی) "یَآ اَیُّھَا الرَّسُوْلُ" (اے رسول) جیسے الفاظ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا گیا ہو تو کیا اس خطاب میں آپ کی امت بھی شامل ہوگی؟ اس میں اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ امت بھی شامل ہوگی۔ سیوطی کے نزدیک زیادہ صحیح یہ ہے کہ امت شامل نہیں ہے۔ اس لیے کہ خطاب کا یہ صیغہ آپ کے ساتھ خاص ہے۔ (۲ : ۲۴)

حاشیۂ فراہی:

أخطأ فإن الصحيح هو التفصيل حسب الموقع (۲ : ۲۴)	غلطی کی، اس لیے کہ صحیح بات حسب موقع تفصیل ہے[۱]۔

(۵۵) ہبۃ اللہ بن سلامہ المفسر بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے آیت کریمہ:

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا (الانسان : ۸)	اور وہ مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں خود اس کے حاجت مند ہوتے ہوئے۔

کے سلسلے میں لکھا کہ اس آیت میں "واسیرا" کا لفظ منسوخ ہے اور اس سے مراد مشرک قیدی ہے۔ جب کتاب ان کے سامنے پڑھی گئی تو ان کی صاحبزادی بھی سن رہی تھیں۔ قاری جب اس مقام پر پہنچا

---

۱ یعنی جہاں سیاق کا تقاضا ہو کہ امت مراد ہو وہاں امت مراد ہوگی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے فاتحہ نظام القرآن مقدمہ ۱۵ "تعیین خطاب"۔ مجموعہ تفاسیر: ۶۲۔ اسالیب القرآن: ۱۳

تو صاحبزادی نے عرض کیا: والد صاحب آپ نے یہاں غلطی کی۔ پوچھا: وہ کیسے؟ کہا: مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ قیدی کو کھانا کھلایا جائے گا، بھوکوں مارا نہیں جائے گا۔ باپ نے تسلیم کیا اور کہا: تم نے سچ کہا۔ (۲ : ۳۱)[۱]

حاشیۂ فراہی:

حكاية عجيبة ذات فوائد (۲ : ۲۹)	ایک عجیب حکایت جو متعدد فوائد پر مشتمل ہے۔

(۵۶) علماء بلاغت کی ایک جماعت ایجاز و اطناب کے درمیان ایک تیسری چیز "مساوات" کی قائل ہے جس میں الفاظ معانی کے مساوی ہوں۔ اس کی مثال میں مصنف تلخیص نے یہ آیت پیش کی ہے[۲]:

وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ (فاطر : ۴۳)	اور بری تدبیر کا وبال اس تدبیر والے ہی پر پڑتا ہے۔

سیوطی لکھتے ہیں کہ اس مثال پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس آیت میں لفظ "السیئ" کی وجہ اطناب ہے کیونکہ "مکر" ہمیشہ "سیئ" (برا) ہوتا ہے۔ (۲ : ۷۰)

حاشیۂ فراہی:

أخطأ فإن المكر ربما لا يكون سيئا ولذلك جاء قوله تعالى: "وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ" (آل عمران : ۵۴) (۲ : ۶۹)	غلطی کی، اس لیے کہ "مکر" (تدبیر) بسا اوقات برا نہیں ہوتا۔ چنانچہ ارشاد باری ہے: اور اللہ تعالیٰ بہترین تدبیریں کرنے والا ہے۔

---

۱ میرے سامنے ہبۃ اللہ بن سلامہ کی کتاب "الناسخ والمنسوخ" کے دو ایڈیشن ہیں۔ یہ واقعہ کسی ایڈیشن میں موجود نہیں۔ سیوطی نے غالباً یہ واقعہ زرکشی (۲ : ۲۹) سے نقل کیا ہے۔ زرکشی کے پاس اس کتاب کا جو نسخہ تھا اس میں یہ واقعہ درج رہا ہوگا۔ (طبری ۲۹ : ۲۰۹-۲۱۰) نے یہ قول قتادہ، عکرمہ اور حسن بصری سے نقل کیا ہے مگر اسے مرجوح قرار دیا ہے۔ ابن الجوزی (نواسخ القرآن : ۵۰۱) نے اس قول کی روایت سعید بن جبیر سے کی ہے جب کہ طبری نے ان کا قول نقل کیا ہے کہ "اسیر" سے مراد مسلم و غیر مسلم سب ہیں۔

۲ تلخیص المفتاح: ۲۱۳

(۵۷) حذف کی اقسام کا ذکر کرتے ہوئے سیوطی ایک قسم "احتباک" کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مجھے یہ قسم صرف احمد بن یوسف الرعینی الاندلسی کی شرح الحلۃ السیراء[1] میں ملی۔ اندلسی نے لکھا ہے: بدیع کی ایک نادر قسم "احتباک" ہے۔ وہ یہ کہ کلام کے پہلے حصہ سے وہ لفظ حذف کر دیا جائے جس کی نظیر دوسرے حصہ میں موجود ہو۔ اسی طرح دوسرے حصہ سے وہ لفظ حذف کر دیا جائے جس کی نظیر پہلے حصہ میں موجود ہو۔ مثلاً آیت کریمہ:

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً
(البقرہ: ۱۷۱)

ان کافروں کی تمثیل ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایسی چیزوں کو پکارے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سنتی سمجھتی ہوں۔

میں تقدیر کلام یوں ہے: "مثل الانبیاء والکفار کمثل الذی ینعق بہ"۔ پہلے حصہ سے "انبیاء" حذف کر دیا گیا کہ "الذی ینعق" اس پر دلالت کر رہا ہے۔ دوسرے ٹکڑے سے "الذی ینعق بہ" حذف کر دیا گیا کہ "الذین کفروا" اس کا پتہ دے رہا ہے۔ (۲: ۷۹)

حاشیۂ فراہی:

لقد قرب أسلوبا من العربية عجيبا ولكن منى عليه وسنذكره: وهو حذف مادلّ عليه مناسبه، ومنه قوله تعالى: "فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ" أى أذاقها طعم الجوع والبسها لباس الخوف. وفى الآية رعاية اللف والنشر ومنه قول الحارث بن

اندلسی عربیت کے ایک عجیب اسلوب کے بالکل قریب پہنچ گیا تھا مگر وہ اس پر مخفی رہ گیا۔ ہم اس کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ اسلوب ہے: "حذف مادلّ علیہ مناسبۃ" (یعنی اس لفظ کو حذف کر دیا جائے جس پر اس کے مناسب دوسرا لفظ دلالت کر رہا ہو[95])۔ آیت کریمہ "فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ" میں یہی اسلوب استعمال ہوا ہے۔ یعنی "فاذاقہا طعم الجوع والبسہا لباس الخوف"

[1] "الحلّة السّيراء" ابن جابر الاندلسی الاعمیٰ (متوفی ۷۸۰ھ) کا بدیعیہ قصیدہ ہے۔

حلزة اليشكرى[1]:
والعيش خير فى ظلال
النوك ممن عاش كدا
(۲: ۴۵)

(پس اللہ تعالیٰ نے اسے بھوک کا مزہ چکھایا اور خوف کا لباس پہنایا۔ آیت میں لف ونشر کی رعایت ہے۔ (حارث بن حلزہ) کے اس شعر میں بھی یہی اسلوب ہے۔ حماقت کے سائے میں آرام کی زندگی بہتر ہے، اس شخص (کی زندگی) سے جو عقل کے ہوتے ہوئے مشقت کی زندگی گزارے۔

(۵۸) سیوطی نے نفی کے سلسلہ میں ایک قاعدہ یہ لکھا ہے کہ مبالغہ فی الفعل کی نفی اصل فعل کی نفی کو مستلزم نہیں۔ پھر اس قاعدہ کی رو سے قرآن مجید کی دو آیتوں کو مشکل بتایا ہے۔ ایک آیت:

وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ
(فصلت: ۴۶)

اور تیرا رب بندوں پر ذرا بھی ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

ہے۔ دوسری آیت:

وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا
(مریم: ۶۴)

اور تیرا رب بھولنے والا نہیں ہے۔

اس کے بعد پہلی آیت کے اشکال کے نو (۹) جواب نقل کیے ہیں۔ ایک جواب یہ ہے کہ "ظلام" اگرچہ کثرت (مبالغہ) کے لیے ہے لیکن "عبید" کے مقابلہ میں ہے جو جمع کثرت ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے

[1] اسالیب القرآن (۲۹) میں مولانا نے اسی اسلوب کی یہ تعریف کی ہے:
"حذف جانبين من المتقابلين لما دلّ عليه مقابله"
اور کئی مثالیں دی ہیں۔ ان میں آیت کریمہ:
"فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ"
اور حارث بن حلزہ کا یہ شعر بھی ہے۔ اسی حذف کی وجہ سے قدامہ بن جعفر نے نقد الشعر میں اس شعر پر نکتہ چینی کی ہے۔ مولانا نے جمہرۃ البلاغۃ (۸۰) میں قدامہ پر تنقید کی ہے اور لکھا ہے کہ یہی عین اسلوب عرب ہے۔ وہ اس لفظ کو حذف کر دیتے ہیں جس کا پتہ اس کا مقابل لفظ دے رہا ہو۔ بلکہ جو کلام عرب کا ماہر نہ ہو اس کے نزدیک اس شعر میں ایک اور عیب ہے وہ یہ کہ "العیش" (زندگی) اور "من عاش" (جو زندگی گزارے) کے درمیان مقابلہ کیا گیا ہے لیکن یہ اسلوب بھی کلام عرب میں عام ہے۔

ظلم کثیر کی نفی کی ہے تاکہ ظلم قلیل کی نفی لازمی طور پر از خود ہو جائے کیونکہ ظالم کے ظلم کا مقصد اس سے فائدہ اٹھانا ہوتا ہے۔ پس اگر نفع کی زیادتی کے باوجود ظلم کثیر ترک کر دے تو ظلم قلیل کو بدرجہ اولیٰ ترک کر دے گا۔ ایک جواب جو ابن مالک نے نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ "ظلام" نسبت کے طور پر صاحب ظلم کے معنی میں ہے۔ (۲ : ۱۰۱)

حاشیۂ فراہی :

فی جمیع الاجوبۃ دلیل علی عدم المعرفۃ بأسلوب کلام العرب[۲] (۲ : ۸۸)	یہ سارے جوابات کلام عرب کے اسلوب سے ناواقفیت کی دلیل ہیں۔[۱]

(۵۹) "تاکید المدح بما یشبہ الذم" کے سلسلہ میں ابن ابی الاصبع المصری نے لکھا ہے کہ قرآن مجید میں مجھے اس کی صرف ایک مثال ملی[۲]:

قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ	ان سے کہو کہ اے اہلِ کتاب تم ہم پر بس اس بات کا غصہ نکال رہے ہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے
(المائدہ : ۵۹)	(تدبر)

امام سیوطی نے اس کی نظیر میں دوسری آیت پیش کی :

وَمَا نَقَمُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ	ان کا عناد صلہ ہے صرف اس بات کا کہ اللہ اور اس کے رسول نے ان کو اپنے فضل سے غنی کیا۔ (تدبر)
(التوبۃ : ۷۴) (۲ : ۱۴۳)	

حاشیۂ فراہی :

و منہ :	اس کی نظیر یہ آیت بھی ہے :[۳]

---

۱ مولانا کے نزدیک مبالغہ کی نفی سے نفی میں مبالغہ پیدا ہوتا ہے۔ دیکھیے اسالیب القرآن : ۴۴

۲ بدیع القرآن : ۵۰

۳ سورۃ الاعراف : ۱۲۶ کی یہ آیت بھی اس کی نظیر ہے :

وَمَا تَنْقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنْ اٰمَنَّا بِاٰیٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا	تم ہمارے در پے آزار صرف اس غصہ میں ہو رہے ہو کہ ہم اپنے رب کی نشانیوں پر جب کہ وہ ہمارے پاس آئیں ایمان لائے۔ (تدبر)

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّاۤ اَنْ یُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ	اور انہوں نے اس پر محض اس وجہ سے غصہ نکالا کہ وہ خدائے عزیز و حمید پر ایمان لائے۔
(البروج : ۸) (۲ : ۱۴۱)	(تدبر)

(۶۰) امام سیوطی نے صنعت طباق کی ایک قسم "ترصیع الکلام" ذکر کی ہے اور تعریف یہ کی ہے کہ کسی قدر مشترک کی وجہ سے ایک چیز کو دوسری کے ساتھ جمع کر دیا جائے۔ مثال میں یہ آیت پیش کی ہے[۱]:

اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَلَا تَعْرٰى وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَلَا تَضْحٰى	یہاں (جنت میں) تو تمہارے لیے یہ (آرام) ہے کہ تم نہ بھوکے رہو گے اور نہ ننگے ہو گے اور نہ یہاں پیاسے ہو گے نہ دھوپ میں تپو گے۔
(طٰہٰ : ۱۱۸ - ۱۱۹)	(تھانوی)

بھوک کا ذکر برہنگی کے ساتھ کیا جب کہ اس کا تعلق پیاس سے ہے۔ اسی طرح پیاس کا ذکر دھوپ کے ساتھ کیا جبکہ اس کو برہنگی کے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن بھوک اور برہنگی میں قدر مشترک خالی ہونا ہے۔ بھوک نام ہے ظاہر کا کھانے سے خالی ہونے کا۔ اور برہنگی نام ہے ظاہر کا لباس سے خالی ہونے کا۔ اس طرح پیاس اور دھوپ جلنے میں مشترک ہیں۔ پیاس میں باطن پانی نہ ملنے کی وجہ سے جلتا ہے اور دھوپ میں ظاہر سورج کی گرمی سے جلتا ہے۔ (۲ : ۱۴۲)

حاشیۂ فراہی :

ھکذا قال ابن القیم وفیہ تکلف (۲ : ۱۰۸)	یہی ابن قیم نے لکھا ہے[۲] اور اس میں تکلف ہے

(۶۱) امام زرکشی نے اپنی کتاب (البرہان فی علوم القرآن) کے شروع میں لکھا ہے کہ عام طور پر مفسرین تفسیر کی ابتدا سبب نزول سے کرتے ہیں۔ اس پر بحث ہوئی ہے کہ کس سے ابتدا بہتر ہے۔ سبب نزول سے کہ سبب سبب سے پہلے ہوتا ہے، یا مناسبت سے کہ اس سے نظم کلام درست ہوتا ہے اور وہ نزول سے پہلے

---

۱ صنعت طباق کی کوئی قسم "ترصیع الکلام" کے نام سے مجھے بلاغت کی عام کتابوں میں نہ مل سکی۔ خود سیوطی نے شرح عقود الجمان میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ اس کی مثال میں سیوطی نے جو آیت پیش کی ہے اور جس کی شرح امام ابن القیم سے نقل کی ہے اسے خود ابن القیم نے الفوائد (۲۱۹) میں مقابلہ معنویہ کی مثال میں پیش کیا ہے۔

۲ بدائع الفوائد ۳ : ۲۴۰، التفسیر القیم : ۳۵۶

ہوتی ہے ؛ پھر لکھا ہے : تحقیق یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ کلام سبب نزول پر موقوف ہے یا نہیں۔ اگر موقوف ہو تو سبب نزول سے ابتدا کی جائے ورنہ مناسبت کو مقدم کرنا بہتر ہے۔ (۲ : ۲۳۶)[۱]

حاشیۂ فراہی :

ھذا موافق بما اخترت فی ترتیب الفصول (۲۰ : ۲۰)	فصلوں کی جو ترتیب میں نے اختیار کی ہے یہ اس کے موافق ہے۔

---

[۱] مولانا نے کتاب العمدۃ (۱ : ۳ : ۱) کے حاشیہ پر اس آیت کی تشریح یہ کی ہے کہ :

" فی الآیۃ نفی لبؤس الدنیا، فإن فیہا شتاءً وصیفاً۔ ففی الشتاء یشتد الجوع، ویقل الرزق ویؤذی الھواء العریان، فیصیبہ الأذی فی باطنہ وظاھرہ وکذلک یتأذی فی جوفہ وضاحی جسمہ، و نظیرہ ھذہ الآیۃ، قال تعالیٰ : " لَا یَرَوْنَ فِیْھَا شَمْسًا وَّلَا زَمْھَرِیْرًا "

ترجمہ :

" آیت میں دنیا کے مشقتوں کی نفی کی گئی ہے۔ دنیا میں جاڑے اور گرمی کے موسم ہوتے ہیں۔ جاڑے میں بھوک کی شدت ہوتی ہے اور رزق میں کمی ہوتی ہے نیز ننگے آدمی کو سرد ہوا تکلیف پہنچاتی ہے۔ چنانچہ آدمی کے ظاہر و باطن دونوں کو اذیت ہوتی ہے۔ اسی طرح گرمی میں بھی جسم کا بیرونی حصہ (دھوپ سے) اور اندرون (پیاس سے) متاثر ہوتے ہیں۔ جنت میں ایسا نہ ہوگا۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : " نہ اس میں گرمی کے آزار سے دوچار ہوں گے نہ سردی کے "۔ (تدبر)

[بشکریہ ششماہی مجلہ علوم القرآن ۔ علی گڑھ ۔ بھارت ۔ شمارہ جولائی ۔ دسمبر ۱۹۸۵ء (جلد ۱ شمارہ ۲)]

تالیفات امام حمید الدین فراہیؒ

	پیسے روپے
۱۔ مجموعہ تفاسیر فراہی :	۶۰-۰۰
۲۔ اقسام القرآن :	۵-۰۰
۳۔ ذبیح کون ہے ؟	۵-۰۰

تالیفات مولانا امین احسن اصلاحی

۱۔ تدبر قرآن ؛ (مکمل سیٹ : ۹ جلد) :	۸۱۰-۰۰
فی جلد :	۹۰-۰۰
۲۔ مبادئ تدبر قرآن :	۱۶-۰۰
۳۔ اسلامی قانون کی تدوین :	۱۲-۰۰
۴۔ اسلامی ریاست :	۳۰-۰۰
۵۔ اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل :	۱۶-۰۰
۶۔ قرآن میں پردے کے احکام :	۳-۰۰
۷۔ تنقیدات :	۱۸-۰۰
۸۔ توضیحات :	۲۱-۰۰
۹۔ تزکیۂ نفس : جلد اول	۴۵-۰۰
جلد دوم :	(زیر طبع)
۱۰۔ اصول تدبر حدیث :	(〃)
۱۱۔ دعوت دین اور اس کا طریق کار :	(〃)
۱۲۔ اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام :	(〃)
۱۳۔ حقیقت شرک و توحید :	(〃)
۱۴۔ حقیقت نماز :	(〃)
۱۵۔ حقیقت تقویٰ :	(〃)

فاران فاؤنڈیشن

۱۲۲۔ فیروزپور روڈ، اچھرہ، لاہور-۱۶ (پاکستان) فون : ۴۱۰۸۴۹